مارچ 2010

قیمت : -/10 روپے

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

’’میں اپنے ملک کے عوام کی طرف سے دوستانہ جذبات اور نیک خواہشات لے کر ہندوستان آئی ہوں‘‘: محترمہ شیخ حسینہ واجد

صدر جمہوریہ محترمہ پرتبھا دیوی سنگھ پاٹل، بنگلہ دیش کی وزیر اعظم محترمہ شیخ حسینہ واجد کو اندرا گاندھی امن ایوارڈ (2009) عطا کرتے ہوئے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

''فکر و تحقیق''

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نامعلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت : 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زر سالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

جلد-12، شمارہ-3، مارچ 2010

مدیر: ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر.کے. پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2

ہماری بات .... ادارہ 6

زبان اور تعلیم

- ہندوستانی زبانوں کی تعلیم اور سی.آئی.آئی.ایل .... منی بھوشن کمار 7
- اردو کی تاریخی اور سماجی اہمیت .... احمد طارق 9
- شمالی ہندوستان میں اردو غزل کا تشکیلی عہد .... محمد زاہد الحق 11
- طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما .... محمد حسن فاروقی 16
- جامعات میں اردو تحقیق .... عطا خورشید 19

ادب اور صحافت

- لکشمن ریکھا کے پار .... آفتاب احمد آفاقی 23
- صحافتی ترجمے کے مسائل .... اسعد رضا 27
- ہند کا محکمہ آثار قدیمہ .... آلوک دیشوال 30
- 2009 کے نوبل انعام یافتگان .... اخبار تحقیق 32

کلاسیکی ادب

- میر باقر حزیں .... سرور الہدیٰ 34

صحت اور ٹیکنالوجی

- جدید سائنسی ترقیات اور ہماری زندگی .... اقبال محی الدین 38
- سورج کی طرف بڑھتے قدم .... عبیدالرحمن 42
- کیا بیکٹیریا بھی دوست ہوسکتا ہے؟ .... مجیب الرحمن 44

ہماری مطبوعات سے

- انسانی حقوق اور قانون کی بالادستی .... خواجہ عبدالمنتقم 47
- اجارہ داری کیا ہے .... ای.اے.جی. رابنسن 50

اردو خبرنامہ .... ادارہ 53

تبصرہ وتعارف 68

- کلیات رشید احمد صدیقی .... وسیم اقبال
- اردو کی کہانی .... سراج نقوی
- جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار .... عاقل زیاد
- سہ ماہی فکر و تحقیق .... معین شاداب
- یوسف مہر علی۔ نئے افق کی کھوج (سوانح حیات) .... عرشیہ خانم
- آزادی کے بعد اردو غزل .... نشاں زیدی
- جانور (حیاتیات اور حیوانات پر مضامین کا مجموعہ) .... یوسف ناظم
- دیگر کتب .... ادارہ

بچوں کا گوشہ

- درختوں کی لڑائی .... شجاع الدین شاہد 76

آپ کی بات

■ پروفیسر شفیق احمد خان ندوی، منزل شفیق، ڈی-223، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

قومی کونسل سے آپ کی غیر حاضری ہمارے لیے نہایت قلق اور دکھ کا باعث رہی تھی۔ غائبانہ طور پر آپ کی باز آمد کے لیے کتنے ہی لوگوں نے دعائیں کی تھیں؛ کیونکہ آپ کے ذریعے اردو زبان اور ملی مفادات کے دروازے بہت دن تک کھلے رہے تھے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ العزیز وہ سلسلہ دوبارہ اور بھی زیادہ قوت سے کھلے گا۔

اردو زبان وادب کی تحسین وپختگی کے عمل میں عربی زبان وادب کا کردار مسلّم ہے۔ اس حقیقت کی شناخت کرتے ہوئے فنکشنل عربی کی ترویج کا جو کام آپ نے سرانجام دلایا ہے، وہ انشاء اللہ یاد رکھا جائے گا اور آپ کے نامۂ اعمال میں بطور حسنات شامل ہوکر باعث اجر ہوگا۔

■ ڈاکٹر ایس. اخلاق اثر، صادق منزل، چوکی امام باڑہ، بھوپال-01

جنوری کا شمارہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ فروغ اردو بھون کی عمارت بہت خوبصورت ہے۔ تصویر میں عمارت کے پاس کی دوری عمارت کا سایہ آگیا ہے یہ یاد آتا ہے کہ سنگِ بنیاد کی تقریب آپ ہی نے آراستہ کی تھی اور افتتاحی تقریب بھی آپ ہی سجائیں گے۔ ''ٹائمز آف انڈیا'' میں فروغ اردو بھون کی آرائش وزیبائش کا ٹینڈر میں نے دیکھ لیا تھا اور اس موقع کا منتظر تھا۔ اردو کے لیے یہ سال بہت اچھا ہے۔ بقول وزیر اعظم جناب منموہن سنگھ جی کے: Finest Mind رکھنے والا وزیر تعلیم کپل سبل اور کونسل کے کارناموں کو وسعت دینے اور عملی جامہ پہنانے والا ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ہے۔

گوشہ زبان، صحافت اور تعلیم بہت معیاری ہے۔ خصوصیت سے ڈاکٹر سیدہ جعفر اور ڈاکٹر محمد احسن کی تحریریں حاصل مطالعہ ہیں۔ اس گوشے میں باقر مہدی پر مضمون کھٹکتا ہے۔ اس بار فیروز بخت صاحب نے مایوس کیا ہے۔ مضمون میں تناسب اور تجزیہ کی کمی ہے۔ ہماری دوسری زبانوں میں تلفظ اور لسانی مہارت کی صورت حال اور خراب ہے۔ فیروز بخت صاحب اپنی بیٹی کے خراب تلفظ کے شاکی ہیں اور مجھے ان سے یہ شکایت ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو وقت نہیں دیتے۔

■ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، سابق ممبر راجیہ سبھا، دہلی

اردو دنیا کے جنوری 2010 کے شمارے میں میرا خط شائع ہوا ہے لیکن اس میں ایک زبردست طباعتی غلطی نظر آئی۔ میں نے لکھا تھا کہ رنگیلا رسول کا مصنف راج پال تھا جسے علم دین نے قتل کردیا تھا مگر اس کی جگہ یہ شائع ہوا کہ رنگیلا رسول سوامی شردھانند کی تصنیف تھی۔ براہ کرم اس کی تصحیح کرشائع فرمادیں۔

اس شمارے میں معلوماتی مضمون اخباری فیچر اور اس کی اقسام حیدرآباد میں آزادی کی جدوجہد ذکر رفتگاں۔ ''قیصر تمکین کی یاد میں'' اور آزادی کا تصور از رفیع احمد قدوائی اور اکبری خانم بہت پسند آئے۔

■ محمد خالد عبیدی، روزنامہ راشٹریہ سہارا، بورنگ روڈ، چوراہا، پٹنہ-01

آپ نے اپنے اداریے (ہماری بات) میں مولانا آزاد کے 131ویں یوم پیدائش پر کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی حیدرآباد کے زیر اہتمام نئی دہلی منعقدہ اردو کانفرنس میں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کپل سبل کے قیمتی خیالات کی جامع تلخیص پیش کردی ہے۔ اردو اور مولانا آزاد کے تعلق سے ان کے خیالات مجھے تو بڑی حد تک انقلابی معلوم ہوئے۔ افسوس کہ جو لوگ اٹھتے بیٹھتے مولانا آزاد، مولانا آزاد کرتے رہتے ہیں وہ بھی مولانا کو ایک صاحب اسلوب صحافی یا ادیب سمجھنے اور سمجھانے میں ہی اپنی ساری قوت وصلاحیت ضائع کردیتے ہیں۔ یہ تو ان کی شخصیت کی ایک جہت ہوئی۔ خوشی ہوتی ہے کہ مولانا نے جو خواب آج سے نصف صدی قبل دیکھا تھا اب شرمندۂ تعبیر ہورہا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے کہا تھا یا تو مجھے آزادی دو یا قبر کے لیے دوگز زمین مہیا کرو۔ میں ایک غلام ملک میں سانس لینے کی بجائے ایک آزاد ملک میں مرنے کو ترجیح دوں گا۔ مجھے لگتا ہے جوہر کے یہ جملے ہمارے اجتماعی حافظے میں تو محفوظ رہے لیکن مولانا آزاد کے ان جملوں کو ہم فراموش کرگئے کہ ''میں ملک کی آزادی کے مطالبے سے دستبردار ہوسکتا ہوں اگر اس کی بنیاد ہندو مسلم نفاق پر رکھی جائے۔'' ہم مولانا آزاد کو یا تو ''غبار خاطر'' وغیرہ کے حوالے سے یاد کرتے ہیں یا جامع مسجد (دہلی) کے منبر سے کی گئی اس تقریر کے حوالے سے جس میں ترک وطن کا ارادہ رکھنے والوں کو غیرت دلائی گئی تھی۔ ہمیں ملک کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے کی گئی مولانا کی کوششوں اور کاوشوں کو نئے سرے سے اپنے مطالعے کا موضوع بنانا چاہیے۔

کانفرنس میں اردو پر بھی مثبت اور امید افزا باتیں ہوئیں، یہ جان کر اچھا لگا۔ کاش ہمارے دانشور اور سیاست داں مل جل کر اردو کے لیے کوئی کارگر لائحہ عمل تجویز کرنے میں کامیاب ہو پاتے۔ اطہر فاروقی کا مضمون (انگریزی نظام تعلیم میں اردو نصاب کا مسئلہ) ہمیں اردو کے نئے مسائل اور امکانات سے

آنکھیں چار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

مضامین سب اچھے ہیں۔ میں خاص طور سے اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت (خالد محمود)۔ اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے تبصرے (سرورالہدیٰ) سے لطف اندوز اور مستفید ہوا۔ 'کلاسیکی تامل اشلوک' پڑھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ فیاض رفعت کا مضمون ''محمود ہاشمی کی یاد میں' پڑھ کر آنکھوں میں مرحوم کا چہرہ پھر گیا۔ محمود ہاشمی کی زندگی علم سے آگہی تک کی ایک رستاخیز داستان تھی۔ انھیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

جناب مخمور سعیدی صاحب کی خدمت میں سلام و نیاز،

■ نذیر احمد ناز، ڈگی وچہ، کشمیر

پچھلے کئی سالوں سے ''اردو دنیا'' زیر مطالعہ ہے۔ یہ اس کی خوبیاں ہی ہیں کہ اس رسالے کے ساتھ رشتہ مضبوط سے مضبوط ہوتا جارہا ہے۔

جنوری کا رسالہ واقعی نئے سال کا نادر تحفہ ہے۔ دیدہ زیب سرورق اور اس پر اردو بھون کی عمارت کا عکس دلفریبی کا سامان پیدا کر رہا ہے۔ اندرونی صفحات پر ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، اکبری خانم نہایت ہی دلچسپ ہے۔ چھن اور اکبری کے کردار آج کے سماج میں زیادہ پنپ رہے ہیں اور محمد عاقل جیسے فہیم اور سیانے لوگوں کی کمی ہورہی ہے۔ امید ہے کہ آپ کلاسیکی ادب سے ایسی تحریریں آئندہ بھی شامل رسالہ کریں گے۔

سید فضل اللہ مکرم کا مضمون ''اخبار کے فیچر اور اس کے اقسام'' نہایت ہی معلوماتی مضمون ہے۔ آج کل کے اردو صحافت سے وابستہ کم افراد ہی ایسے رموز سے واقف ہیں۔ اخبارات کو کیسے دلچسپ بنائیں یہ گر تو صحافی کو جاننا چاہیے۔ ہمارے کشمیر کا تو یہ حال ہے کہ ہر ایرا گیرا نتھو خیرا صحافتی میدان میں اترتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کشمیر کے بیشتر اردو اخبارات صحافتی چاشنی سے محروم ہیں۔ صفحہ 26 پر فیروز بخت احمد نے اردو زبان کی ترویج سے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ''کارنجار بدست گلکار'' کے مصداق یہاں ہر چیز اُلٹی جارہی ہے۔ یہ وبا اب کشمیر میں بھی وارد ہوچکی ہے۔ قومی شاہراہ پر لگے سنگِ میل اور سائن بورڈوں پر اردو میں تحریر کردہ عبارتیں اردو کو پیش آرہی آفت کا حال بتارہی ہیں۔ حالانکہ کشمیر میں اردو جاننے اور لکھنے والے ہر جگہ موجود ہیں اس پر طرّہ یہ کہ یہاں کی اردو شناس اور اردو دوست برادری بالعموم اور دانشورانِ اردو بالخصوص اس وبا کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔

مزید برآں محترم ایڈیٹر صاحب کے سامنے تجویز رکھنے کی جسارت کرتا ہوں کہ جہاں آپ نے بچوں کے لیے کہانی کا انتظام کر رکھا ہے وہاں آپ اپنے رسالے میں معیاری مزاح کو بھی ایک ورق وقف کردیں تاکہ رسالے میں مزید شگفتگی پیدا ہوسکے۔

■ بکل اُتساہی، علرام پور

اردو دنیا شمارہ جنوری 2010 باصرہ نواز ہوا۔ اسی بہانے آپ نے ایک دور افتادہ، ہمالہ کی ترائی کے باسی کو یاد فرمایا جس کے لیے بے حد مشکور ہوں۔ مشمولات بیحد امتیازی اور لائق استفادہ ہیں۔ ''اردو دنیا'' کا دوسرا پہلو یعنی جریدہ ''فکر و تحقیق'' کا اشتہار بھی پُرکشش ہے۔ کبھی اس کی زیارت نہیں کرسکا اگر مناسب سمجھیں تو میرے نام اسے بھی جاری کردیں سالانہ خریداری کی رقم حاضر کردوں گا۔

■ سید اطہر رضا بلگرامی، B-40، جوہری فارم، اوکھلا، نئی دہلی-25

''اردو دنیا'' پابندی سے مل رہا ہے اور مستقبل مزاجی سے زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔ مضامین کا انتخاب یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ اردو زبان میں سائنس، ٹیکنالوجی، ماحولیات سے وابستہ معلومات و عصری مسائل پر پُرمغز مضامین، اردو زبان کی قدر و قیمت بڑھا رہے ہیں۔ ان موضوعات پر انگلش میں تو پڑھتا ہی رہتا ہوں لیکن دل میں یہ خواہش رہتی ہے کہ کاش یہ تکنیکی نکات، یہ فکر، یہ وضاحتیں اردو جامہ پہن لیں۔ کوئی زبان عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرکے ہی زندہ رہ سکتی ہے اور آپ ان کی تکمیل کرکے اردو کے زندہ زبان ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔

پچھلے چند شماروں میں سائنس اور ماحولیات سے وابستہ مضامین بہت معلوماتی اور اصطلاحات کی وضاحتوں کے اعتبار سے یقیناً قابلِ قدر ہیں۔ ان مضامین نے شوق و تجسس کو ہوا دی ہے۔ اردو زبان پر فخر کا احساس ہوتا ہے۔ میری جانب سے تمام مصنفین کو مبارکباد پیش کیجیے۔ میری نظر میں اردو زبان کی یہی صحیح خدمت ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر ''اردو دنیا'' کی یہی روش قائم رہی تو اردو ایک کھوئے ہوئے عزیز کی مانند ہر گھر میں بیٹھی مسکرا رہی ہوگی۔

■ محمد مکرم شاہین، اتر ٹولہ، بھرہ پورہ، بھاگلپور، بہار

قابلِ مبارکباد ہیں آپ اور لائق صد ستائش ہے آپ کا ماہنامہ ''اردو دنیا'' جو آپ کی ادارت میں تیزگامی سے منزل مقصود کی طرف رواں ہے۔ جنوری 2010 کے شمارے میں شائع شدہ سبھی مضامین اچھے اور چند بہت اچھے اور معلومات افزا ہیں۔ مثلاً ''ذرائع ابلاغ اور فاصلاتی تعلیمی ادارے''، ''تعلیمی نفسیات کا ایک جدید تصور'' وغیرہ فیروز بخت صاحب نے اپنے مضمون ''اردو زبان کے تعلق سے'' میں جو کچھ فرمایا ہے وہ بہت حد تک میرے خیالات کے مماثل ہے۔ ہم اپنے گرد و پیش بھی کچھ اسی طرح کے نظارے دیکھتے ہیں علاوہ ازیں لسانی تعصب نے بھی ہماری اس زبان کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ میں اپنے یہاں بھاگلپور کی حالت بتاؤں تو شاید یقین نہ ہو کہ سال گذشتہ انٹر کے وہ طلبہ جو اختیاری مضمون کے طور پر اردو پڑھنا چاہتے تھے انھیں حیلے بہانے سے روکنے کی

کوشش کی گئی اور انھیں مجبور کیا گیا کہ وہ اردو نہ پڑھیں۔ نیز ایک کالج ایسا بھی ہے جہاں اردو خاص سبجیکٹ کے طور پر پڑھائی جاتی ہے مگر انٹر اور گریجویشن کی ساری کلاسیں لینے کے لیے تقریباً گذشتہ چھ ماہ سے صرف ایک اردو استاد کی خدمات لی جارہی ہیں۔ کیا ایسا عمل تعصب اور بدنیتی کا ثبوت نہیں؟ ہمارے بھاگلپور میں اردو کی نامور شخصیتیں بھی ہیں مگر میں ان کی توصیف میں اردو دنیا کے کسی شمارے میں اردو خبرنامہ کے تحت شائع شدہ چار مصرعے نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔

بدن پر جینس اردو کی، گلے میں ٹائی اردو کی
کہ ساری عمر کھائی ہے فقط بالائی اردو کی
پروفیسر یہ اردو کے جو اردو سے کماتے ہیں
اسی پیسے سے بچوں کو یہ انگریزی پڑھاتے ہیں
(احمد علوی)

اور ایک بات جو کافی اہم ہے یہ کہ ماہ جنوری کے شمارے کا سرورق دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی لیکن اس محل کا نام ''فروغ اردو بھون'' دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے دانت کے نیچے کنکر پس گیا ہو۔ فروغ اردو کے ساتھ ''بھون'' کا لفظ جو (بحوالۂ فیروز اللغات) سنسکرت کا لفظ ہے۔ اردو میں اس کے کئی مترادف ایوان، قصر، محل، منزل وغیرہ کی صورت میں مستعمل ہیں۔

■ **شاغل ادیب، 1-4-304/9/3، زیب منزل، مشیر آباد، حیدر آباد-48**

اردو دنیا کا نئے سال 2000 کا پہلا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ شکریہ۔ زبان، صحافت اور تعلیم کے کالم کے سبھی مضامین اچھے ہیں۔ لیکن محترمہ سیدہ جعفر صاحبہ، عبدالسمیع اور فیروز بخت کے مضامین خصوصی طور پر پسند آئے۔ محترمہ سیدہ جعفر کا مضمون ''حیدرآباد میں آزادی کی جدوجہد'' حقیقی تاریخی واقعات اور سچے مجاہدوں کے سچے حوالے لیے ہوئے ہے۔ عبدالسمیع صاحب کا مضمون بہت محتاط انداز میں لکھا گیا ہے کیوں کہ اردو ادب میں یگانہ چنگیزی اور کالی نظم، غزل اور تنقید کے خالق باقر مہدی دونوں کی شخصیتیں اور تحریریں دونوں متنازعہ رہی ہیں۔ فیروز احمد بخت کا مضمون ''کچھ اردو زبان کی ترویج کے تعلق سے'' اردو اسکولوں کی بدحالی، اردو اسکولوں میں طلبہ وطالبات کی کمی، اردو ٹیچروں اور پروفیسروں کی اردو کی روٹی کھا کر اردو سے بے وفائی۔ اور خود ہم اردو والوں کی اردو سے لاپروائی کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ کلاسیکی ادب میں میر عبدالحئی کا تعارف ونمونۂ کلام اور ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی ''اکبری خانم'' ہمارے کلاسیکی ادب کی ترجمانی کرتی اچھی مثالیں لیے ہوئے ہے۔ عہد حاضر کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ آج کے شعرا و ادبا اپنے پرکھوں کی تہذیب اپنے کلاسیکی ادبی ورثے سے اپنے آپ کو دور رکھنے کو اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں دیگر تمام مشمولات بھی قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ اردو دنیا میں بچوں کے ادب کی پیشکش بھی قابل قدر وتحسین ہے۔

■ **معراج الدین چودوری، سلچر، کچھاڑ، اسام-788006**

''اردو دنیا'' اکتوبر 2009 سے پڑھ رہا ہوں۔ مجھے خود پر غصہ آرہا ہے کہ کیوں ایسے شاندار اور مفید رسالے سے اتنے دن بے خبر رہا۔ میں کلکتہ سے شائع ہونے والے بنگلہ ہفت روزہ ''قلم'' کا کالمسٹ ہوں اور سلچر سے ''فرق'' نامی ہفت روزہ کا اڈیٹر ہوں۔ اس سلسلے سے بہت سے اخباروں کو پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ ''اردو دنیا'' ایک لاجواب ماہنامہ ہے۔ اردو زبان ہندوستان کی ایک فصیح اور بلیغ زبان ہے۔ اس کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جو کچھ کر رہی ہے وہ لائق تحسین ہے۔

■ **عارف حسن وسطوی، نیوز پروڈیوسر، ای ٹی وی، حیدرآباد**

نئے سال کا پہلا شمارہ ملا۔ سرورق ہی دیکھ دل باغ باغ ہوگیا۔ امید کی جاتی ہے کہ قومی اردو کونسل کی نئی عمارت آپ کی قیادت میں اندرونی اعتبار سے بھی نئی نئی پیش رفت کے ساتھ اتنی ہی خوبصورت ثابت ہوگی۔ جنوری کے شمارے کے تمام مشمولات اچھے ہیں۔ سید فضل اللہ مکرم کی تحریر اخبار کے فیچر اور اس کی اقسام خاصا متوجہ کرنے والی ہے۔ سیدہ جعفر کا مضمون حیدرآباد میں آزادی کی جدوجہد معلومات میں اضافہ کرنے والا ہے۔ ذرائع ابلاغ اور فاصلاتی تعلیمی ادارے میں محمد احسن نے طالب علموں کا کام بہت حد تک سہل کرنے کی کوشش کی ہے۔ باقر مہدی کی یگانہ پسندی عبدالسمیع صاحب کی ادب شناسی کی دلیل ہے۔ محمد افروز عالم نے تعلیمی نفسیات کا ایک جدید تصور پیش کر کے تعلیم اور اس کے حصول میں جذبات کے کارفرما ہونے کو بہت خوب پیش کیا ہے۔ عابد سہیل کی تحریر قیصر تمکین کی یاد میں مرحوم سے ان کے دلی لگاؤ کی آئینہ دار ہے۔ یہ اردو دنیا کا اعجاز ہے کہ زبان و ادب کے ساتھ ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کی معلوماتی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ محمد خلیل کی تحریر چاند پر پانی کی دریافت اور محمد اعجاز کا مضمون میڈیسن انڈسٹری اور گرافک ڈیزائن میں روزگار کے مواقع ہماری سائنسی تشنگی اور روزگار کے حصول کی الجھنوں کو دور کرنے والے ہیں۔

■ **حکیم غزالی انور ہلال سلفی، بی بی پاکڑ، نزد ملت کالج، دربھنگہ، بہار**

میں ''اردو دنیا'' کا پرانا قاری ہوں اور اس رسالے کے ساتھ ساتھ سہ ماہی ''فکر وتحقیق'' کا خریدار بھی بن گیا ہوں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترقی وفروغ کے لیے ہر وقت اللہ سے دعا گو رہتا ہوں۔ آج یعنی 12 محرم الحرام 1431ھ کو ای ٹی وی اردو (ETV Urdu) پر یہ خبر سننے کو ملی کہ دہلی میں NCPUL کا نیا دفتر بن کر تیار ہوگیا ہے اور اس کا نام فروغ اردو بھون رکھا گیا

ہے۔ یہ خبر میرے لیے اور میرے خیال میں تمام اردو کے چاہنے والوں کے لیے ایک خوشخبری ہے۔ میں اسے اردو والوں کے لیے نئے سال کے تحفہ کے طور پر دیکھتا ہوں۔ خبر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ نئی عمارت کافی وسیع و عریض بنائی گئی ہے۔ اور جلد ہی کونسل کا دفتر آر کے پورم سے منتقل ہوکر اس نئی عمارت میں چلا جائے گا۔ اللہ کرے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) اپنے اس نئے فروغ اردو بھون میں پہلے سے بھی زیادہ فعال اور متحرک ہوجائے۔ جب بھی دہلی آنا ہوا تو اس نئی عمارت کا دورہ اور آپ سے ملاقات انشاء اللہ ضرور کروں گا۔ آپ تمام لوگوں کو یہ نیا بھون بہت بہت مبارک ہو۔

■ **زرینہ پروین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد**

ماشاء اللہ رسالہ ''اردو دنیا'' ہر زاویۂ نظر سے فرحت بخش ہے۔ دلی مسرت کی بات یہ کہ جب سے میں نے اس رسالے کا رجسٹریشن کرایا بروقت موصول ہورہا ہے۔ شکریہ۔ میں کونسل کی سرگرم کارکردگی کے لیے ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ صاحب اور کونسل کے دیگر ممبران کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اس رسالے میں اردو زبان و ادب، تعلیم، سیاست اور صحافت پر جامع اور بلیغ مضامین قابلِ غور ہوتے ہی ہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور کیریئر سازی سے متعلق بھی تحریریں شامل رہتی ہیں۔ تبصرے بھی معلومات میں اضافے کا باعث بنتے ہیں'' بچوں کا گوشہ'' میں بعض کارآمد باتیں نہایت سادگی سے کہہ دی جاتی ہیں جن سے ہم بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔

■ **ندیم احمد قادری، C-36/5، لین نمبر-2، آر. کے. مارگ، چوہان بانگر، دہلی-110053**

فروری 2010 کا ''اردو دنیا'' کا شمارہ وقت پر موصول ہوا۔ سرورق کافی پسند آیا مضامین بھی کافی معیاری اور معلوماتی ہیں۔ بچوں کے ادب کے لیے چند صفحات کا اگر اضافہ ہو جائے تو مزید بہتر ہوگا۔ علاوہ ازیں جدید عصری علوم سے متعلق چند معلوماتی مضامین کو بھی اگر شامل کرلیا جائے تو ''اردو دنیا'' برصغیر میں اردو کا سب سے اہم معلوماتی جریدہ بن سکتا ہے اور اردو داں طبقے کی علمی تشنگی دور ہوسکتی ہے۔

■ **پرویز احمد خاں، اینگلو عربک اسکول، اجمیری گیٹ، دہلی**

آپ کا رسالہ ''اردو دنیا'' اردو دنیا پر اپنا ایک خاص اثر قائم کررہا ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین معیاری ہوتے ہیں اور ان میں قارئین کی دلچسپی کا وافر سامان ہوتا ہے۔ یہی دلچسپی نئے نئے قارئین پیدا کرتی ہے ان میں یہ احقر بھی شامل ہے۔ آپ کے رسالے میں اردو افسانے سے متعلق کئی مضامین شائع ہوئے جو قابلِ ستائش بھی تھے مثلاً افسانہ اور انشائیہ کے حدود، یا پریم چند کا افسانہ سودائے خام، یا آگ کا دریا پر تبصرہ ہو سب کے سب قابلِ قدر ہیں لیکن افسانے کے حوالے سے ایک تشنگی باقی رہ جاتی ہے اگر قارئین افسانے کی تاریخی روایت اور تناظر سے ناآشنا ہوں تو افسانے اور دیگر نثری اصناف کی تفریق سے محظوظ نہیں ہوا جاسکتا ہے۔ □□□

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کا شمار اردو کے اہم جدید نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب ''نئی شعری روایت'' نے اردو میں جدیدیت کی بنیادیں مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ کتاب تین مستقل ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب بعنوان بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت اور اس کے مضمرات لکھا گیا ہے، دوسرا باب نئی جمالیات اور تخلیقی عمل ہے اور تیسرا اظہار و ابلاغ کے مسائل پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔

صفحات: 240، قیمت-/127 روپے

اردو زبان کی تدریس

مصنف: معین الدین

اردو کیسے پڑھی اور پڑھائی جائے درس و تدریس کے جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں تدریسی طریقۂ کار کا تعین طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ یہ کتاب طلبہ و اساتذہ کی انھی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

پانچواں ایڈیشن، صفحات: 148، قیمت-/29 روپے

ہماری بات

ہندوستان ایک امن پسند جمہوری ملک ہے۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے عالمی سیاست میں پرامن ہم وجودیت یا بقائے باہم کے جس اصول کو متعارف کرایا تھا اس کی اہمیت اور افادیت آج بھی مسلّم ہے۔ سماجی بہبود، اقتصادی ترقی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے دنیا میں ایک پرامن ماحول کی موجودگی ضروری ہے اور یہ موجودگی منحصر ہے مختلف ملکوں کے درمیان باہمی خیر سگالی کے جذبے پر۔ باہمی خیر سگالی کا یہ جذبہ جتنا صدق دلانہ اور مضبوط ہوگا اتنے ہی اس کے مثبت نتائج برآمد ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

بنگلہ دیش ہندوستان کا قریبی پڑوسی ملک ہے جہاں وقتاً فوقتاً جمہوری عمل کو کمزور کرنے والی حکومتیں بھی قائم ہوئی ہیں لیکن ہندوستانی عوام کی طرح بنگلہ دیشی عوام بھی جمہوریت پسند ہیں اس لیے وہاں کے سیاسی نظام سے جمہوری عنصر یکسر خارج کبھی نہیں ہوا۔ وہاں کی موجودہ وزیراعظم شیخ حسینہ شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی ہیں اور اپنے والد کی طرح ہی جمہوری اصولوں پر غیر متزلزل یقین رکھتی ہیں۔ ان کی اسی خوبی کی وجہ سے ہندوستان نے انھیں ہمیشہ عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا ہے اور خود ان کے دل میں بھی ہندوستان کے لیے یہی عزت و احترام موجود ہے جس کا اظہار ان کے حالیہ دورۂ ہند کے دوران بھی ہوا۔

گذشتہ ماہ 11 جنوری کو اپنے سہ روزہ دورۂ ہند پر محترمہ شیخ حسینہ واجد ہندوستان پہنچیں تو نئی دہلی کے راشٹرپتی بھون میں ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ دسمبر 2009 کے عام انتخابات میں برسراقتدار آنے کے بعد یہ ہندوستان کا ان کا پہلا دورہ تھا۔ راشٹرپتی بھون کی استقبالیہ تقریب کے بعد شیخ حسینہ مہاتما گاندھی کی سمادھی پر پہنچیں اور وہاں گلہائے عقیدت پیش کیے۔ بعدازاں انھوں نے صدر جمہوریہ محترمہ پرتبھا پاٹل، وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ اور انڈین نیشنل کانگریس کی سربراہ محترمہ سونیا گاندھی سے ملاقات کی۔ ان ملاقاتوں میں جو تپاک تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں طرف خیر سگالی کے کیسے صدق دلانہ جذبات کام کر رہے ہیں۔ شیخ حسینہ نے وزیر خارجہ پرنب مکرجی اور لوک سبھا میں حزبِ اختلاف لیڈر محترمہ سشما سوراج سے بھی ملاقات کی اور باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلۂ خیال کیا۔ قبل ازیں وزیر خارجہ ایس ایم کرشنا نے موریہ ہوٹل جاکر ان سے ملاقات کی جہاں سرکاری طور پر ان کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔

محترمہ حسینہ واجد کی ہندوستان آمد کے دوسرے دن یعنی 12 جنوری کو انھیں راشٹرپتی بھون میں صدر جمہوریہ محترمہ پرتبھا پاٹل کے ہاتھوں اندرا گاندھی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اس تقریب میں دوسرے معزز مہمانوں کے علاوہ وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ اور یو پی اے کی چیئرمین محترمہ سونیا گاندھی جی بھی موجود تھیں۔ وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے شیخ حسینہ کو ایک ممتاز عالمی رہنما قرار دیتے ہوئے کہا کہ پڑوسی ملک میں جمہوریت کی بحالی بہت حد تک ان کی ہمت، قربانی اور عوام کی قوت ارادی میں ان کے غیر متزلزل یقین کی بدولت ہی ہوئی ہے۔ صدر پرتبھا پاٹل کے دست مبارک سے 2009 کا اندرا گاندھی ایوارڈ برائے امن، ترقی اور ترک اسلحہ دیے جانے کے بعد ڈاکٹر منموہن سنگھ نے کہا کہ موجودہ دور کے بین الاقوامی چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے بین الاقوامی تعاون کے حوالے سے ان کی جس بصیرت کا اظہار پچھلے سال اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ان کی تقریر میں ہوا تھا، اس کے لحاظ سے اس سال انھیں یہ انعام دیا جانا عین مناسب ہے۔ یوں بھی بنگلہ دیش کے عوام کی سماجی اور اقتصادی ترقی سے محترمہ اندرا گاندھی کو گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے محترمہ شیخ حسینہ کے وژن 2021 کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مقصد غریبی کا خاتمہ، بنیادی ضرورتوں کی چیزوں کی یقینی فراہمی اور زرعی سیکٹر میں ترقیاتی سرگرمیوں کے ذریعے بنگلہ دیش میں ایک نئے دور کا آغاز کرنا ہے جو فارغ البالی اور خوش حالی کا دور ہوگا۔ ڈاکٹر من موہن سنگھ نے امید ظاہر کی کہ ہندوستان اور بنگلہ دیش دونوں ملکوں کے عوام ایک روشن اور تابناک مستقبل کی تعمیر میں مل جل کر حصہ لیں گے اور باہمی تعاون اور اعتماد کی راہ پر گامزن رہیں گے۔ محترمہ حسینہ واجد نے ڈاکٹر من موہن سنگھ کے ان خیالات کی پرجوش اور پرزور انداز میں تائید کی۔

محترمہ حسینہ واجد نے اس موقع پر کہا کہ میں اپنے ملک کے عوام کی طرف سے دوستانہ جذبات اور نیک خواہشات لے کر ہندوستان آئی ہوں۔ ہندوستان ہمارا پرانا دوست ہے ایسا دوست جس کی دوستی پر ہم اعتبار کرسکتے ہیں۔ ہم جنوبی ایشیا میں دوستی اور تعاون کا ماحول قائم کرنے کے آرزومند ہیں تاکہ ہم اپنے سب سے بڑے دشمن یعنی غریبی کا مل جل کر مقابلہ کرسکیں اور اسے شکست دیں۔ یہ میرا ایسا خواب ہے جسے میں جلد سے جلد حقیقت میں بدلنا چاہتی ہوں۔

شیخ حسینہ کی انتھک جدوجہد کے نتیجے میں بنگلہ دیش میں جمہوری نظام کی بحالی اور اس اہم مقصد میں کامیابی کے بعد ان کا ہندوستان کا دورہ ایک اہم سیاسی واقعہ ہے جو دوررس خوشگوار اثرات پیدا کرے گا اور ان دو قریبی پڑوسی ملکوں کے درمیان باہمی خیر سگالی اور تعاون کی نئی راہیں کھلیں گی۔

□□□

منی بھوشن کمار

ہندوستانی زبانوں کی تعلیم اور سی.آئی.آئی.ایل (C.I.I.L.)

زبان کی اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ کوئی بھی انسان خواہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ، اپنے خیالات کے اظہار کے لیے کسی نہ کسی زبان یا بولی کا ہی استعمال کرتا ہے۔ ''ابلاغ وترسیل'' سے الگ زبان کے سیاسی، سماجی، تاریخی، معاشی اور ثقافتی رول پر اگر سرسری نگاہ بھی ڈالی جائے تو زبان کی اہمیت کے بہت سے تاریک گوشے از خود آئینہ ہو جائیں گے۔

ہندوستان کے لسانی نقشے پر نظر ڈالیں تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں سینکڑوں کی تعداد میں ایسی زبانیں موجود ہیں جن کا ادبی سرمایہ بے حد وسیع ہے اور اگر ان میں علاقائی بولیوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان کی تعداد کئی گنا بڑھ جائے گی۔ ماہرین لسانیات نے ہندوستانی زبانوں کی جو خانہ بندی کی ہے، اس کے مطابق یہاں ''ہندآریائی''، ''دراوڑی''، ''آسٹرو ایشیاٹک'' اور ''تبتی برمی'' خاندان کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہمالہ کے علاقے کی کچھ زبانوں کی خانہ بندی ابھی نہیں ہو سکی ہے۔ متذکرہ بالا لسانی خاندانوں میں ہندآریائی زبانوں کے بولنے والے سب سے زیادہ یعنی تقریباً 74 فی صد ہیں جب کہ 24 فی صد لوگ دراوڑی خاندان کی زبانیں بولتے ہیں اور یہ دوسرے نمبر پر ہیں۔ 1 فی صد سے بھی کم آبادی کے ساتھ آخری نمبر پر تبتی برمی خاندان کی زبانیں بولنے والوں کا شمار ہوتا ہے۔ ان مختلف خاندان کی زبانوں کی کتنی بھی مختصر فہرست بلا ترتیب تیار کی جائے تو اس میں پچاس ساٹھ زبانوں کے نام بڑی آسانی سے گنائے جا سکتے ہیں۔

اب ایسے کثیر لسانی ماحول میں زبانوں کی وجہ سے اختلافات کا پیدا ہونا فطری بات ہے۔ آئینِ ہند کے نفاذ کے بعد کی صورت حال پر اگر غور کریں تو ہندی (دیوناگری رسم خط میں) کو انگریزی کے ساتھ سرکاری نیز دفتری زبان کا درجہ دیا گیا۔ انگریزی کو سرکاری کام کاج سے باہر کرنے کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی تھی لیکن کچھ صوبوں کی شدید مخالفت کے بعد، جو بعض علاقوں میں تشدد کی حد بھی پار کر گئی، حکومت ہند کو نئی لسانی پالیسی اختیار کرنی پڑی۔ اس مخالفت کی بنیادی وجہ اپنی لسانی پہچان کو بنائے رکھنے کی سعی ہی تو تھی۔ ہندوستان کی جغرافیائی اور تہذیبی یکجہتی کو بنائے رکھنے کے لیے بے حد ضروری تھا کہ مختلف زبانوں کے بولنے والے اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ ملک کی دوسری زبانیں بھی سیکھیں اور انھیں کام میں لائیں۔

انھی حالات اور ضروریات کے پیشِ نظر ''ہندوستانی زبانوں کے مرکزی ادارے'' (Central Institute of Indian Languages) کا قیام بہ تاریخ 17 جولائی 1969، میسور (کرناٹک) میں عمل میں آیا۔ اس ادارے کے اہم کاموں کی مختصر ترین فہرست درج ذیل ہو سکتی ہے:

(1) زبان کے معاملے میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو مشورے دینا اور مدد پہنچانا۔

(2) تمام ہندوستانی زبانوں کے ارتقا کے لیے مواد تیار کرنا۔

(3) چھوٹی، اقلیتی اور Tribal زبانوں کی حفاظت

(4) لسانی ہم آہنگی کو بڑھاوا دینے کے لیے 20 ہندوستانی زبانوں کی تعلیم Non-native Learners کو دینا۔

حکومت ہند کی جانب سے لسانی اشتراک کو فروغ دینے کی خاطر سی۔آئی۔آئی۔ایل۔ فی الوقت اپنے سات مختلف علاقائی مراکز کے ذریعے 20 زبانوں میں کل وقتی ڈپلوما کورس کرا رہی ہے۔ یہ 20 زبانیں وہ ہیں جن کی شمولیت آئینِ ہند کی آٹھویں فہرست (Eighth Schedule) میں ہے۔ حالانکہ آٹھویں فہرست (Eighth Schedule) میں کل 22 زبانیں درج ہیں لیکن ان میں سے بھی ہندی اور سنسکرت میں ڈپلوما کورس نہیں کرایا جاتا ہے۔ ابھی جن زبانوں میں یہ ڈپلوما کورس کرایا جا رہا ہے، ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

کنڑ، ملیالم، تامل، تیلگو، بنگلہ، میتھلی، اُڑیا، سنتالی، ڈوگری، کشمیری، پنجابی، اردو، گجراتی، کونکنی، مراٹھی، سندھی، آسامیا، بوڈو، منی پوری اور نیپالی۔

اردو کے علاوہ دوسری تمام زبانوں کی تعلیم صرف ایک ہی مرکز پر دی جا رہی ہے۔ اردو اس معاملے میں بے حد خوش نصیب زبان سمجھی جا سکتی ہے کہ اس کی تعلیم تین مراکز پر فراہم کرائی جا رہی ہے۔ ان میں اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر (Urdu Teaching & Research Centre) لکھنؤ (یو.پی.) اور سولن (ہماچل پردیش) تو صرف اردو کی تعلیم کے لیے ہی وقف ہیں۔ اردو کی تعلیم دینے والے تینوں مراکز (لکھنؤ، سولن اور پٹیالہ) میں داخلے کے لیے مقررہ سیٹوں کی کل تعداد 88 تک پہنچ جاتی ہے جو کسی بھی زبان کے لیے مقرر سیٹ سے زیادہ ہے۔

ان زبانوں میں کل وقتی ڈپلوما کورس کی میعاد دس مہینے ہے۔ ان دس مہینوں میں 14 ہفتے (420 گھنٹے) بیسک کورس (Basic Course) کے لیے، 12 ہفتے (360 گھنٹے) انٹرمیڈیٹ کورس (Intermediate Course) کے لیے اور 12 ہفتے (360 گھنٹے) ایڈوانس کورس (Advance Course) کے لیے مقرر ہیں۔ ہر زبان کی تدریس میں لسانی تجزیے، زبان

کے طریقۂ تدریس اور ترجمہ نگاری کا بھی درس دیا جاتا ہے۔ 6 گھنٹے روزانہ کلاس روم (Class Room) میں لگانے ہوتے ہیں۔ میعادی امتحانات کے علاوہ طالب علم کو ہر کورس کے آخر میں ایک امتحان دینا ہوتا ہے جس میں کامیابی کے لیے 60فی صد نمبر حاصل کرنا لازمی ہے۔ اس تعلیمی عمل میں متعلقہ مرکز از خود تیار کردہ ضروری مواد فراہم کراتا ہے۔ ایڈوانس کورس کے آخر میں دو ہفتے کے دورے پر کسی خاص مقام پر لینگویج ٹور (Language Tour) پر طلبہ کو لے جایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد طلبہ کی بولنے، سننے اور سمجھنے کی قوت کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ انھیں مخصوص زبان کے بولنے والوں کے سماجی اطوار، عقائد اور تہذیب سے روبہ رو کرانا ہوتا ہے۔ پورے کورس کے دوران بیسک کورس کے خاتمے پر 15 دنوں کی تعطیل کے علاوہ 10 روز کی اتفاقی چھٹی (Casual Leave) بھی دی جاتی ہے۔ حالانکہ ٹریننگ کی درمیانی مدت میں کسی اور کورس میں داخلے کی ممانعت ہوتی ہے۔

داخلہ ہر سال فروری مہینے کے آخر یا مارچ کے شروع میں ہوتا ہے۔ داخلے کا اشتہار روزگار سماچار، Employment News کے علاوہ اہم مقامی اخبارات میں بھی شائع کرایا جاتا ہے۔ سی.آئی.آئی.ایل. (C.I.I.L.) کی ویب سائٹ www.ciil.org پر بھی متذکرہ اشتہار کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ سبھی زبانوں کی پچاس فی صد سیٹیں ان ثانوی اسکولوں کے اساتذہ کے لیے مخصوص ہیں جو سرکاری امداد حاصل کرنے والے یا سرکار سے منظور شدہ (Recognised) ہیں۔ اساتذہ کو کم از کم تین سال کا تدریسی تجربہ ہونا چاہیے۔ 20فی صد سیٹیں ان افراد کے لیے مخصوص ہیں جو پی.ایچ.ڈی. (Ph.D.) کر رہے ہیں یا پی.ایچ.ڈی. (Ph.D.) کورس میں داخلے کے متمنی ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی مخصوص زبان کا علم ان کے تحقیقی کام میں معاون ثابت ہوگا۔ 10 فی صد سیٹوں کو ان اقلیتی زبانوں کے بولنے والوں (Minority Language Speaker) کے لیے محفوظ رکھا گیا ہے جو کسی بڑی زبان کو سیکھ کر اپنی مادری زبان کے فروغ کا خیال رکھتے ہوں۔ اس کے لیے ان کی تعلیمی صلاحیت کم از کم بی.اے. (B.A.) مقرر ہے۔ بقیہ 20 فی صد سیٹیں کھلے داخلے (Open Admission) کے لیے رکھی گئی ہیں۔ ہر وہ شخص جو مختلف زبانوں کو سیکھنے کی خواہش رکھتا ہے اور اس نے کم از کم بی.اے. (B.A.) تک تعلیم حاصل کی ہے، متذکرہ زمرے میں اپنی امیدواری کی درخواست دے سکتا ہے۔

داخلے کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ کوئی شخص جس زبان کو سیکھنا چاہتا ہے، اُسے اُس زبان کا ذرا بھی علم نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی اس زبان کی کسی بھی سطح پر کوئی تعلیم حاصل نہ کی گئی ہو یا ایسی کوئی سند امیدوار کے پاس نہ ہو۔ وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے لیکن وہ اردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے اور ان کے پاس اردو کی تعلیم کی کوئی سند نہیں ہے، اپنی مادری زبان میں بہتری لانے کے لیے درخواست ضرور دیں۔ ساتھ ہی وہ لوگ بھی جو اپنی مادری زبان اردو سے کلی طور پر نابلد ہیں، انھیں بھی اس موقعے کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ساتھ ہی وہ لوگ جو اردو کے واقف کار ہیں، وہ دوسری زبانیں سیکھ کر اردو زبان وادب کے سرمایے میں اضافے کا باعث ہو سکتے ہیں۔

ٹریننگ کے دوران سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کو وہی تنخواہ دی جاتی ہے جس پر وہ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ دوسرے تمام داخلہ یافتہ اشخاص کو جنھیں کسی اور ادارے سے کوئی مالی سہولت یا فیلوشپ حاصل نہیں ہو رہی ہے، پانچ ہزار روپے ماہانہ بہ طور تنخواہ دیے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی انھیں آٹھ سو روپے ماہانہ سٹائی پنڈ (Stipend) بھی ملتا ہے۔ اس طرح کل اٹھاون سو روپے (5800=800+500) ہر مہینے ایک طالب علم کو دیے جاتے ہیں۔ علاقائی مرکز (Regional Centre) تک آنے اور واپس گھر جانے اور لینگویج ٹور (Language Tour) پر جانے کا خرچ بھی حسب ضوابط دیا جاتا ہے۔ سبھی علاقائی مراکز پر تقریباً ساٹھ فی صد طلبہ کے لیے ہاسٹل کا انتظام ہے۔ اس میں دور دراز کے علاقوں سے آئے طلبہ کو اوّلیت دی جاتی ہے۔ بقیہ طلبہ کو اپنے رہنے ٹھہرنے کا انتظام خود کرنا ہوتا ہے۔

اس ڈپلوما کورس کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کے بعد بہ طور استاد آپ حکومت کے سہ لسانی فارمولے (Three Language Formulae) کی تکمیل میں معاون ثابت ہوں گے۔ اگر آپ ہر ہفتے کم از کم دس طلبہ کو سیکھی ہوئی زبان کا درس دیتے ہیں تو آپ ہر مہینے تنخواہ سے الگ ستر روپے نقد پانے کے حق دار ہوں گے۔ یہ کورس ملک کے مختلف حصوں کے افراد کے ساتھ آپ کے تعلقات میں اضافے کا باعث اور آپ کی شخصیت کے ارتقا میں بھی معاون ہوتا ہے۔ یہ آپ کی قوت ترسیل وابلاغ کو بہتر بناتا ہے اور جدید طریقۂ تدریس نیز زبان، ادب اور تہذیب کے معاملے میں آپ کی صلاحیتوں کو نکھارتا ہے۔ علاوہ ازیں ٹریننگ یافتہ شخص سی.آئی.آئی.ایل. (C.I.I.L.) کی تحقیقی کارکردگی (Research Programmes) میں شامل ہوکر علمی اور معاشی دونوں اعتبار سے مستفید ہو سکتا ہے۔

اس ضمن میں مزید جانکاری کے لیے درج ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے:

Director, C.I.I.L. (Deptt. of Higher Education, Ministry of Human Resource Development) Mans Gangotri, Hansu Road, Mysore-570006-

□□□

پتہ:
C/o Ravindra Kumar (Art.), V.+P.-Aunta,
Dist. Patna (Bihar) 803302

احمد طارق

اردو کی تاریخی اور سماجی اہمیت

ہندوستان کی تہذیبی اور لسانی تاریخ میں اردو زبان کی حیثیت ایک ایسے دریا کے مانند ہے جس کے سبک رفتار تسلسل میں تاریخ کے کسی موڑ پر کبھی فرق واقع نہیں ہوا ہے اور جو گذشتہ کئی صدیوں سے پورے ملک کو سرسبز و شاداب کر رہا ہے۔ کیسے بھی حالات ہوں اس کے سوتے تاریخ کے کسی موڑ پر خشک نہیں ہوئے بلکہ تاریخ و سیاست کے ہر نازک موڑ پر اس کی روانی اور طغیانی میں اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر تاراچند انیسویں صدی میں رونما ہونے والے اردو ہندی قضیے کا ذکر کرتے ہوئے، جسے انگریز حکمرانوں نے شعوری طور پر ابھار کر دونوں قوموں کے مابین خلیج حائل کرنے کی کوشش کی، گذشتہ صدیوں میں اردو کی ملکی سطح پر مقبولیت کا اعتراف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''ان تمام صدیوں میں ہندی (یعنی فارسی آمیز ہندوستانی)، نہ کہ جدید ہندی (سنسکرت آمیز ہندوستانی) ہندوستان کی لنگوا فرانکا تھی، اور شائستہ سوسائٹی کی زبان تھی، خواہ ہندو خواہ مسلم۔''

ڈاکٹر تاراچند: The Problem of Hindustani, Allahabad, Indian Periodicals, Ltd., 1944, p-86 بحوالہ: اردو کا ابتدائی زمانہ (ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو) شمس الرحمٰن فاروقی، ص-41

اردو زبان کے ادبی سرمائے کے مطالعے کے بغیر ہندوستان کی کئی صدیوں کی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی تاریخ اور اس کے پیچ و خم سے واقف ہونا ممکن نہیں ہے۔

اردو زبان کی ابتدا ہندوستان کی لسانی تاریخ میں ایک ایسے وقت پر ہوئی جب تاریخی حالات اور عوامی ضرورتوں نے شمالی ہند میں ایک ''نئی زبان'' کی پیدائش کے لیے سازگار ماحول تیار کر دیا تھا۔ ''مقدمۂ تاریخ زبان اردو'' کے مصنف پروفیسر مسعود حسین خاں کے مطابق ہندوستان میں جدید آریائی زبانوں کے طلوع کا زمانہ تقریباً 1000 کے آس پاس شروع ہوتا ہے۔ اتفاق سے اسی دور میں ہندوستان پر محمود غزنوی کے پے در پے حملوں کا آغاز بھی ہوا اور اس کے نتیجے میں صوبۂ پنجاب کا الحاق سلطنت غزنی سے مستقل طور پر ہو گیا۔ چنانچہ پنجاب اور اس کے اطراف کی زبانوں پر نو وارد مسلمانوں کی زبان کے اثرات پڑنا شروع ہوئے۔ امیر خسرو نے اپنی تصنیف ''غرۃ الکمال'' میں پنجاب کے شاعر مسعود سعد سلمان (متوفی 30-1125) کے ''ہندی زبان'' میں دیوان مرتب کرنے کی اطلاع دی ہے۔ اس سے قبل 712 میں فتح سندھ کے بعد وہاں کی زبان اور تہذیب پر عربوں کے اثرات مرتب ہو چکے تھے۔

ہندوستان کی تہذیبی اور سیاسی تاریخ میں سلطنت دہلی کا قیام ایک اہم واقعہ ہے۔ مسلم حکمرانوں نے اپنی حکمت عملی، حسن تدبیر، عدل و انصاف اور حسن انتظام سے غیر مسلم رعایا کا دل جیت لیا جس سے ملک اور معاشرے کو استحکام حاصل ہوا اور دونوں قوموں کے درمیان ہم آہنگی اور یک جہتی کی تہذیبی فضا قائم ہوئی۔ ''ہند ایرانی تہذیب''، ''اسلامی تمدن ہند''، ''انڈو مسلم کلچر'' اور ''مشترکہ ہندوستانی تہذیب'' کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ شمالی ہند میں تشکیل پذیر نئی ''عوامی زبان'' پر بھی ہندوستان کے نئے حکمرانوں کی مذہبی، تہذیبی اور لسانی روایات کا گہرا اثر پڑا اور اسے ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور ترکی جیسی علمی زبانوں کے ادبی سرمائے سے اکتساب فیض کے مواقع حاصل ہوئے۔ جس کے زیر اثر اردو زبان نے ایک مخصوص دلکش ساخت اختیار کی اور جلد ہی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی ہندوی، ہندی، دکنی، گجراتی، ریختہ، ہندوستانی اور اردو کے روپ میں پورے ملک کی زبان بن گئی۔

مختلف زبانوں کے باہمی میل جول سے ارتقا پذیر ہونے والی اردو زبان نے ابتدا سے ہی سیکولر کردار اپنایا۔ اس نے مختلف زبانوں کے الفاظ کو اپنے دامن میں اس طرح جذب کیا کہ آج ان کے اصل ماخذ کی شناخت بھی آسان نہیں۔

ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے باہمی میل جول سے جو ''گنگا جمنی تہذیب'' کی آبیاری ہوئی اس کے نقوش فکر و فلسفہ، علوم و فنون، سیاست و مذہب اور معاشرتی زندگی کی رنگارنگیوں میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اردو زبان اس تہذیب کے تمام مظاہر میں ایک اہم توانا اور پر قوت مظہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زبان نے تاریخ کے ہر موڑ پر اپنے عہد کے اجتماعی احساسات و جذبات اور عصری صداقتوں کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اس زبان نے اپنے سیکولر کردار سے ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور جذبۂ خیر سگالی کو فروغ دیا۔ اس زبان کی مقبولیت اور ہمہ گیری کا ذکر کرتے ہوئے میر امن ''باغ و بہار'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اب خداوند نعمت، صاحب مروت، نجیبوں کے قدردان جان گل کرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے، جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں، جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔'' (باغ و بہار (دیباچہ) ! میر امن ص 516)

غور طلب ہے کہ انگریز حکمران امور حکومت کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کی غرض سے اردو زبان سے واقفیت کو لازمی تصور کرتے تھے کیونکہ ہندوستانی کی یہ واحد زبان تھی جسے ہندوستانی کی ''لنگوا فرانکا'' کا درجہ حاصل

تھا۔ لیکن یہ ''صاحبانِ والاشان'' کی سیاست کی کرشمہ سازیاں ہی تھیں کہ انھوں نے فورٹ ولیم کالج میں ''بھاکھامنشی'' للولال جی کا تقرر کرکے اردو۔ ہندی کے لسانی اور سیاسی اختلاف کی پہلی اینٹ رکھی۔ واضح ہو کہ للولال جی کا تقرر'' بھاکھامنشی'' کی حیثیت سے اس لیے کیا گیا کیوں کہ

''اس عہد میں اردو بمقابلہ ہندی (= زمانہ حال کی ہندی) یا ہندوستانی بمقابلہ ہندی (= زمانہ حال کی کھڑی بولی ہندی) ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی اور لفظ ہندی۔۔۔ بلاشرکت غیرے صرف اردو زبان کے لیے مستعمل تھا۔ علاقائی بولیاں اپنے اپنے ناموں سے جانی جاتی تھیں، یا انھیں محض بھاکھا/ بھاشا کہہ دیا جاتا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کے منشی جو سب کے سب اردو داں تھے فورٹ ولیم کالج کو مدرسۂ ہندی کہتے تھے۔۔۔''

(ایک بھاشا۔۔۔ جو مسترد کردی گئی: مرزا خلیل احمد بیگ، ص-97)

انیسویں صدی کی آخری دہائیوں تک ملک کے طول و عرض میں اردو کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جدید ہندی کے سب سے بڑے مبلغ بھارتیندو ہریش چندر خود اردو میں شاعری کرتے تھے، اور رسا تخلص کرتے تھے۔ بھارتیندو 1871 میں اپنی کتاب ''اگروالوں کی اتپتی'' کے دیباچے میں رقمطراز ہیں۔

''ان کا (اگروالوں کا) مکھیہ دیش پچھّو تر پرانت ہے اور ان کی بولی، استری اور پرش سب کی کھڑی بولی ارتھات اردو ہے۔''

(بحوالہ ایک بھاشا۔۔۔ جو مسترد کردی گئی۔ مرزا خلیل احمد بیگ، ص-112)

لیکن چند برسوں کے اندر اندر بھارتیندو کے خیالات میں تغیر رونما ہوا اور ہم دیکھتے ہیں کہ ''انیسویں صدی کے اواخر میں وہ اردو چھوڑ کر'' ہندی'' کی طرف جا رہے تھے، اور یہی نہیں کہ وہ اردو کو ترک کر رہے تھے، وہ ''اردو بیگم'' کی ''موت'' کے بارے میں انتہائی جارحانہ، بلکہ رکیک طنزیہ تحریریں بھی لکھ رہے تھے۔''

(اردو کا ابتدائی زمانہ (ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو)
شمس الرحمٰن فاروقی، ص-40)

چنانچہ بھارتیندو ہریش چندر 1882 میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے اپنی گواہی میں ہندی کی حمایت اور اردو کی مخالفت میں یوں گوہرافشانی کرتے ہیں۔

''ناگری حروف کو رائج کرنے سے ان (مسلمانوں) کا نقصان یہ ہوگا کہ لوگوں کو لوٹنے کھسوٹنے کا موقع ان کے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اس وقت وہ لکھتے کچھ اور پڑھتے کچھ اور ہیں اور تحریروں کا مفاہیم بھی غلط بیان کرتے ہیں۔ دفاتر میں فارسی حروف کا استعمال نہ صرف یہ کہ ہندوؤں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ بلکہ یہ محترمہ ملکۂ عالیہ (ملکہ وکٹوریہ) کی وفادار رعایا کی اکثریت کے لیے زحمت اور ناخوشی کا باعث بھی ہے۔''

(بھارتیندو ہریش چندر کی ایجوکیشن کمیشن کے سامنے انگریزی زبان میں درج گواہی کا اردو ترجمہ بحوالہ اردو کا ابتدائی زمانہ (ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو)، شمس الرحمٰن فاروقی، ص 41-40)

اردو زبان تنوعات اور رنگارنگی کے حامل ہندوستانی سماج میں مشترکہ وسیلۂ اظہار کے طور پر وجود میں آئی۔ جس نے پورے سماج کو ایک رشتۂ محبت و اتحاد میں پرونے کا کام کیا۔ اس زبان کا ڈھانچہ، آہنگ، لے اور محاورہ ہندوستانی قوم کی ''شخصیت'' کا بھرپور اظہار کرتے ہیں۔ اس کے الفاظ کے سرمائے کی تہہ دار اور پراسرار دنیا میں تہذیب وثقافت اور سماج وسیاست کی تبدیل ہوتی ہوئی شکلوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ یہ اردو زبان کا قومی اور سیکولر کردار ہی ہے۔ اگر ایک طرف اس زبان میں قرآن مجید اور مذہب اسلام سے متعلق عربی وفارسی زبان کی کتابوں کے تراجم ہوئے تو دوسری جانب ہندو مذہب کی مقدس کتابوں وید، اپنشد، رامائن، مہابھارت اور گیتا وغیرہ کے بھی متعدد تراجم ہوئے۔ انسانی تاریخ میں ایثار اور قربانی کی عظیم ترین مثال حضرت امام حسینؓ کی شہادت سے متعلق مراثی کا پورا سرمایہ ہندوستانی مٹی اور رسوم و رواج کی خوشبو میں بسا ہوا ہے۔ اردو زبان کے شعرا کا یہ کارنامہ معمولی نہیں کہ انھوں نے آنحضرتؐ کے نواسے اور ان کے خانوادے کے دیگر محترم اشخاص کے بیان میں ہندوستانی تہذیبی اور سماجی روایات کی پیروی کی اور ان کا بیان اس انداز میں کیا کہ واقعۂ کربلا سے متعلق یہ کردار صحرائے عرب کے بجائے ہندوستان کی مٹی اور آب و ہوا میں سانس لیتے نظر آتے ہیں۔

تہذیبی وثقافتی رنگارنگی کے حامل اس ملک کی ایک خصوصیت لسانی بوقلمونی بھی ہے۔ ہندوستان میں اتنی زبانیں بولی جاتی ہیں کہ ماہرین لسانیات نے اس خطۂ ارض کو'' زبانوں کے جنگل'' سے تعبیر کیا ہے۔ واضح ہو کہ 1991 کی مردم شماری کی رپورٹ میں ''مادری زبانوں'' کی حیثیت سے درج زبانوں کی کل تعداد 216 ہے۔ ان میں سے ہر زبان کے بولنے والوں کی تعداد کم سے کم دس ہزار ہے۔

(''ایک بھاشا۔۔۔ جو مسترد کردی گئی'' مرزا خلیل احمد بیگ، ص-128)

ان میں سے ہر زبان کی اپنی اہمیت ہے اور اسے فروغ کے مواقع بھی حاصل ہونے چاہئیں۔ لیکن اس تلخ حقیقت سے صرف نظر کرنا مشکل ہے کہ تہذیبی اور علاقائی عصبیت کے ساتھ ساتھ لسانی عصبیت بھی اس ملک کے اتحاد اور سالمیت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ چنانچہ اس معاشرے کو ایک ایسی زبان کی ضرورت بہرحال رہے گی جس کا کردار روادارانہ ہو اور جو اپنی فراخدلی کی بدولت دل موہ لینے کی صلاحیت سے مالامال ہو۔ اس معیار پر اردو کھری اترتی ہے۔ جو گذشتہ کئی صدیوں سے ''لنگوافرانکا'' کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتی رہی ہے۔ 1880 کا محمد حسین آزاد کا یہ بیان آج بھی بامعنی اور مبنی برحقیقت ہے کہ

''۔۔۔ اگر بچوں بیچ ہندوستان میں کھڑے ہو کر آواز دیں کہ اس ملک کی زبان کیا ہے تو جواب یہی سنیں گے کہ اردو۔''

(آب حیات: محمد حسین آزاد، ص-61)

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu, Brailly College, Brailly

محمد زاہد الحق

شمالی ہندوستان میں اردو غزل کا تشکیلی عہد

اردو کی ابتدا کے سلسلے میں محققین کے درمیان بھلے ہی اختلافات ہوں لیکن اس سچائی سے انکار مشکل ہے کہ اردو کا ابتدائی سرمایہ شمالی ہندوستان میں ہی ملتا ہے۔ مسعود سعد سلمان (1046 تا 1121) اور امیر خسرو (1253 تا 1325) ایسے دو معروف ہندوی مصنفین ہیں جن کی خدمات پر گفتگو کیے بغیر شمالی ہندوستان میں اردو کے ارتقا کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ مسعود سعد سلمان کے دیوان کے بارے میں دو مستند اطلاعات بالعموم محققین کے سامنے رہی ہیں۔ محمد عوفی نے 1220 سے 1227 کے دوران جب اپنا فارسی تذکرہ ''لباب الالباب'' مکمل کیا تو اس میں مسعود سعد سلمان کے عربی، فارسی دواوین کے ساتھ ہندوی دیوان کا بھی تذکرہ کیا۔ امیر خسرو نے اپنے دیوان ''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں اپنی شاعرانہ عظمت کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے اس میں مسعود سعد سلمان کے ہندوی دیوان کا ذکر موجود ہے۔ خسرو لکھتے ہیں:

''پیش ازیں از پادشاہانِ سخن کسے راسہ دیوان نہ بود، مگر مرا، کہ خسرو ممالکِ کلام۔ مسعود سعد سلمان اگرچہ ہست، اما این سہ دیوان در سہ عبارت است، عربی و پارسی و ہندوی۔''

(ترجمہ: اب سے پہلے بادشاہان سخن میں کوئی ایسا نہ تھا جس کے تین دیوان ہوں، سوا میرے، کہ خسرو ممالک کلام ہوں۔ مسعود سعد سلمان کے تین دیوان ہیں تو، لیکن وہ تین عبارتوں میں ہیں، عربی اور فارسی اور ہندوی)۔

اس اقتباس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ مسعود سعد سلمان اور خسرو دونوں نے ہندوی میں اپنا کلام کہا۔ ان دونوں شعرا کے درمیان میں بھی تقریباً دو سو برسوں کا فرق ہے۔ اس دوران شعر و ادب کی سمت و رفتار، مصنفین اور تصنیف و تالیف کے ماحول وغیرہ کے بارے میں کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہے۔ مسعود سعد سلمان کا دیوان بھی دستیاب نہیں ہے۔ ان کے فارسی کلام میں چند ہندوی الفاظ کی نشاندہی محمد عوفی نے کی ہے۔ یہ دیوان اگر ہمیں حاصل ہوگیا ہوتا تو اردو کی ابتدائی شکل کے بارے میں ہماری گفتگو کا مواد زیادہ مستند ہوتا۔

شمالی ہندوستان کے ادبی منظرنامے پر مسعود سعد سلمان کے بعد ابوالحسن یمین الدین امیر خسرو کا مقام امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ امیر خسرو نے اپنے ہندوی کلام کی بابت یہ اطلاع دی ہے کہ ''میں نے نظمِ ہندوی کے چند جزو دوستوں کی نذر کیے ہیں۔'' خسرو کے بیان سے ان کے ہندوی کلام کا اختصار واضح ہے۔ بدنصیبی سے خسرو کا بھی ہندوی کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ ان کے نام سے جو پہیلیاں، مکرنیاں، کہہ مکرنیاں وغیرہ منسوب ہیں، ان کے متن کے استناد کا مسئلہ ہنوز حل طلب ہے۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ان کا الحاقی کلام ان کے اصل کلام میں اس طرح شیر و شکر ہوگیا ہے کہ اصل اور نقل کا فرق کرنا ناممکن ہے۔ خسرو کے متن کا ادبی نمونے کے طور پر استعمال کرنا دو دھاری تلوار پر چلنا ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ خسرو نے ہندوی میں شعر کہے اور مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ لیکن ان میں مستند متن کون سا ہے، وثوق سے نہیں کہا جاسکتا۔

جہاں تک خسرو کی غزل گوئی کا تعلق ہے اس میں بھی متن کے مسائل کچھ اس سے مختلف نہیں۔ خسرو کے نام سے منسوب کلام میں ایک غزل بہت مشہور ہے۔ اسے قدیم بیاضوں سے محققین نے جمع کیا اور خسرو کے کلام کے طور پر پیش کیا وہ غزل ملاحظہ ہو:

ز حالِ مسکیں مکن تغافل، دورائے نیناں، بنائے بتیاں
چوتابِ ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے کہ جا سناوے پیارے پی سے ہماری بتیاں
شبانِ ہجراں دراز چو زلف، زمانِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
چو شمع ہجراں، چو ذرہ حیراں، ہمیشہ گریاں بہ عشق آں مہ
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں
بحق آں مہ کہ روز محشر بداد مارا فریب خسرو
سپیت من کے درآئے راکھوں جو جاے پاں پیا کی کھتیاں

مختلف بیاضوں میں خسرو کے نام سے منسوب کئی اور غزلیں بھی ملتی ہیں لیکن انھیں خسرو کے مستند کلام کے طور پر تسلیم کرکے تنقیدی تجزیے کا حصہ بنانا اس وجہ سے نامناسب ہے کہ ان کا پایۂ استناد نہایت معمولی ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ کا یہ واقعہ حیرت انگیز ہے کہ خسرو نے اپنا ہندوی کلام خود محفوظ نہیں کیا اور نہ ہمعصر یا مستند تذکروں میں کہیں ان کا متن محفوظ ہے۔ خسرو کی ہشت پہلو شخصیت کی وجہ سے ان کی مقبولیت گذشتہ سات سو برسوں میں برابر بڑھتی رہی ہے۔ مقبولیت کے ساتھ ساتھ عقیدت اور حلقہ بندی نے بھی خسرو کی زندگی کے بعد ان کے ہندوی کلام میں ترمیم و اضافہ اور رد و بدل کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع کیا مختلف معتقدین اور چاہنے والے خسرو کے کلام میں اضافہ کرتے رہے۔ اس کی وجہ سے خسرو کے اصل ہندوی کلام میں الحاقی کلام کا اس قدر اضافہ ہوگیا کہ سات سو برس کے بعد اب یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا

کہ خسرو کے نام سے جو کلام ہمارے سامنے موجود ہے اس کا ایک لفظ بھی اصل ہے یا نہیں۔

ایک مسئلہ اور بھی ہے کہ خسرو نے آخر اپنے ہندوی کلام کو محفوظ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ جہاں فارسی میں اتنا ضخیم سرمایہ خسرو نے مدون کیا وہاں ہندوی کو اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ اسے قلمبند کرلیں۔ ہندوی کے بارے میں خسرو نے اپنی فارسی کتابوں میں ضرور تفصیل سے لکھا ہے لیکن اس سے آگے اندھیرا ہے۔ جس عہد میں خسرو غزل سرا تھے اس وقت پورا سماج اشرافیت زدہ تھا۔ خسرو خود ترکی النسل تھے اور فارسی کے عظیم شاعر۔ ایک دو نہیں پانچ بادشاہوں کے درباری شاعر رہے اور سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے مرید او رمقرب خاص۔ اتنے فضائل کے باوجود زمانے کی روایات سے روگردانی کرکے ہی خسرو نے خود کو Declass کرتے ہوئے ہندوی کی طرف رخ کیا تھا۔ شاید وہ اپنے بیان کی عوامی وسعت تلاش کررہے تھے لیکن رواج زمانہ اور اشرافیہ تقاضے انھیں اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ ایک زیر تشکیل عوامی زبان میں تفریح طبع کے لیے جو کلام پیش کیا اسے محفوظ کرلیں۔ انھی اسباب سے خسرو کا ہندوی کلام محفوظ نہ ہوسکا اور محققین کے لیے یہ ایک ایسا مسئلہ بن گیا جواب تک حل نہیں ہوسکا ہے۔

خسرو کے نام سے معتبر اور نامعتبر ہندوی کلام کے درجنوں نمونے ہیں۔ تاریخی اور تحقیقی کتابوں میں بھی خسرو کے ہندوی کلام کا متن ملتا ہے۔ ہم چاہیں بھی تو معتبر اور نامعتبر یا الحاقی اور غیر الحاقی کے فرق کو طے نہیں کرسکتے۔ ایک کلام سے دوسرے کلام کی زبان میں اتنا فرق آجاتا ہے کہ ان دونوں متون کو ایک دور کا ماننا مشکل ہوجاتا ہے۔ خسرو کے کلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد میں جس ہندوی غزل کی داغ بیل رکھی وہ فارسیت سے دور، عوامی بولی ٹھولی سے قریب، رواں دواں فکر سے عبارت ہوگی۔ موسیقیت اس کا لازمی حصہ رہی ہوگی اور موضوعاتی سطح پر اس میں ایک عمومی رجحان رہا ہوگا۔ اب بھی امیر خسرو کی شخصیت سے متعلق جو ان کی ہندوی شبیہہ قائم ہوئی ہے اس میں ایک طلسماتی فضا، محبوبانہ کیفیت اور عجیب دل آویزی جھلکتی ہے لیکن تحقیق کے طالب علم کے ہاتھ امیر خسرو کے متن ہندوی کے مستند نمونے کے حوالے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بندھ گئے ہیں۔ اس لیے اردو کی ابتدائی غزل کا خاکہ اندازوں اور قیاسات کی بنیاد پر ہی تیار کیا جاسکتا ہے۔

امیر خسرو کی وفات (1325) اور جعفر زٹلی کی وفات (1713) کے درمیان تقریباً چار سو برس کا وقفہ ہے لیکن اس دوران جعفر زٹلی کے علاوہ شمالی ہندوستان کی شاعری میں کوئی ایسی قابل ذکر شخصیت نہیں ابھرتی جسے تاریخ ادب اردو میں سنگ میل قرار دیا جاسکے۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں شیخ عثمان، شیخ جنید، منشی ولی رام، مولانا عابدی، شیخ نصیر الحق، شاہ مراد، محمد جان وغیرہ شعرا کا ان کے کلام کے نمونوں کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض مصنفین کے کلام پر پروفیسر سیدہ جعفر اور پروفیسر گیان چند جین کی مشترکہ کتاب ''تاریخ ادب اردو کی جلد پنجم میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ جمیل جالبی نے بھی بعض مصنفین کا ضمناً تذکرہ کیا ہے لیکن ان شعرا کے کلام کے استناد پر بھی محققین کو شک ہے۔ ایسے میں اگر ان چار سو برسوں کے درمیان غزل گو شعرا پر نظر ڈالیں تو مکمل شاعر کی حیثیت سے صرف جعفر زٹلی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی گو شعرا میں مرزا عبدالقادر بیدل اور سراج الدین علی خان آرزو کے بعض غزلیہ اشعار کو بھی بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ سچائی یہ ہے کہ اس دوران شمالی ہندوستان میں واقعتاً جعفر زٹلی ہی اردو زبان کو تخلیقی اظہار کا بھرپور ذریعہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔

عام طور پر جعفر زٹلی کو ایک فحش گو اور عریاں نگار شاعر سمجھ کر ادبی تذکرے سے دور رکھا جاتا رہا ہے۔ اس کے دیوان کی اشاعت میں بھی کلام سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ رہا۔ یہ بیسویں صدی میں ممکن ہوا کہ تاریخ ادب اردو کے مختلف ابواب ترتیب دیے جانے کے دوران محققین کو یہ محسوس ہوا کہ جعفر زٹلی کے کلام میں ''زٹلیات'' یا فحش گوئی کا جتنا عنصر ہے اس سے زیادہ وہ سماجی اور سیاسی شاعری ہے۔ اس کے کلام کے بالاستیعاب مطالعے نے ہماری آنکھیں کھولیں کہ جعفر کو درکنار کرکے ہم نے اپنی تاریخ کا ایک مستند ستون خود سے گرانے کی کوشش کی تھی۔ شمس الرحمن فاروقی جعفر زٹلی کی ادبی اہمیت کو اس طور پر تسلیم کرتے ہیں:

''جعفر زٹلی کو بہ آسانی اردو کا سب سے بڑا طنز نگار کہا جاسکتا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں، کیوں کہ اردو میں اعلیٰ درجے کی طنزیہ نظم ونثر کی کمی نہیں ہے۔ لیکن زٹلی محض طنز نگار نہیں ہیں۔ وہ الفاظ کے پارکھ اور شائق بھی ہیں۔ ان کے مختصر کلیات میں جتنے تازہ الفاظ ہیں (فحشیات کو نظر انداز کردیں تب بھی) اتنی تعداد میں تازہ الفاظ ان کے کلیات کا دوگنا حجم رکھنے والے شاعر کے کلام میں بھی نہ ہوں گے ...... زٹلی کی بہت ساری فحاشی ایک طریقہ ہے غصے، ناپسندیدگی اور برہمی کے اظہار کا۔ کچھ فحاشی ان کی اپنی واماندگی حال کے بیان میں کام آتی ہے۔ کچھ ایسی ہے جہاں وہ اپنی طبیعت کی جولانی دکھاتے ہیں۔''

جعفر شمالی ہندوستان کا پہلا نظم گو اور غزل گو ہے۔ اس کے کلیات میں ایسی تخلیقات بڑی تعداد میں ہیں جنھیں آپ ایک ساتھ غزل اور نظم دونوں میں شامل کرسکتے ہیں۔ جعفر کا پورا ادبی رجحان مسائل سے عبارت ہے اس لیے ان کے یہاں غزل بھی نظم کا انداز یا غزل مسلسل کی ادائے خاص لیے ہوئے ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنے مرتبہ کلیات میں ''در وصف محبوب و تکیہ کلام عوام الناس۔'' کو نظم کے بطور شامل کیا ہے حالانکہ تسلسل کے علاوہ تمام خصوصیات غزل کی ہیں۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے روے تو چوں ماہِ شب تار، جو ہے سو
تجھ سا نہ کہیں دل بر و دل دار، جو ہے سو
اب ہا ہا کروں پیّاں پڑوں، لیبوں بلیّاں
خندوں میں نہ مل بیٹھ، نہ کر پیار، جو ہے سو
اے یار جفا پیشہ، پری چہرہ، ستمگارا!
من پنڈت پرکھنڈت و حیرانِ تو ہستم
از دوری و مہجوری تو نیست صبوری
اے شاہِ بتاں، ماہ رخ! امروز چہ گویم
تیری تو لطافت کی بڑی دھوم پڑی ہے
اے جانِ جہاں! عاشق و آشفتۂ خودرا
میرے تو کلیجے میں لگی پریم کٹاری
اے سرو سہی! حسن ترا ہمچو زلیخا
گردست دہد وصلِ تو، صد جاں کنم از شوق
اے یار! مکن میل بہ گفتارِ رقیباں
از آہِ دلِ خستہ خبردار! جو ہے سو
در گردنِ من زلف تو زنار، جو ہے سو
لکھ بھیج کشل کھیم سماچار، جو ہے سو
از روزِ ازل با تو مجھے پیار، جو ہے سو
در گلبن و ہر گلشن و گلزار، جو ہے سو
دیوانہ و بیگانہ مپندار، جو ہے سو
برتن چہ زنی خنجر و تلوار، جو ہے سو
حورانِ بہشت اند خریدار، جو ہے سو
برخاک کفِ پاے تو ایثار، جو ہے سو
از دردِ دلِ سوختہ ہشیار، جو ہے سو

یہ اشعار یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ جعفر کے سرمایۂ سخن میں غزل کا صنفی مزاج کیوں کر بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ جس بے تکلفانہ فضا میں جعفر نے محبوب سے گفتگو کا سلسلہ قائم کیا ہے وہ غزل کی وہی مانوس، آزمودہ اور کارآمد فضا ہے جس میں شمالی ہندوستان میں اردو کی غزلیں سامنے آئیں۔ فرق صرف بیچ بیچ میں تمسخر اور استہزا کا ہے جس سے جعفر زٹلی اپنا انفرادی رنگ سخن قائم کرتے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی جعفر کی زباں دانی اور لسانی تصرفات پر گفتگو کرتے ہوئے جعفر کی تاریخی اہمیت کو زباں شناسی کے حوالے سے اس طرح پیش کرتے ہیں:

''میر جعفر کے کلیات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں اردو اور فارسی میں گنگا جمنی پیوند دیے جانے کا دستور تھا۔ اور زبان کی وہ شاہراہ جو بہ تقلیدِ دکن عہد محمد شاہ میں قائم ہوئی ہے، اس وقت تک تیار نہیں ہوئی تھی۔ ان کا کلیات اگرچہ مختصر ہے تاہم اس میں ہم سینکڑوں عجیب و غریب الفاظ پاتے ہیں جو آج متروک ہیں۔ ثقہ و سنجیدہ مضامین پر انھوں نے بہت کم ہاتھ ڈالا ہے۔ لفاظی میں نظیر اکبرآبادی سے کم نہیں ہیں۔ ان کی طباعی اور ذہانت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ زبان اردو کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے کلیات میں موجود ہے۔''

جعفر اپنے عہد کا بہترین نباض ہے۔ زمانے کی ہر دھڑکن پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کے یہاں طنز، غصے میں بدل جاتا ہے لیکن کہیں بھی شگفتہ انداز بیان سے وہ پیچھے نہیں ہٹتے۔ رشید حسن خاں نے جعفر کے غیر معتبر کلام کے طور پر اس مشہور غزل کے سات اشعار شامل کیے ہیں جسے محمود شیرانی اور جمیل جالبی نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ اس غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

مقرر ایک دن مرنا، قبر میں سخت دکھ بھرنا
الٰہی کرم توں کرنا کہ آخر خاک ہوجانا
ہزاروں شہر کے راجا، جنو مکھ چاند ہے لاجا
نقارہ موت کا باجا کہ آخر خاک ہوجانا
محمد پاک پیغمبر، خلق میں چاند سیں انور
انھوں پر جان بھی بل بل کہ آخر خاک ہوجانا
علی حق راہ کم عالم (کذا) کیا ان زیر سب ظالم
رہے نحیں موت میں سالم کہ آخر خاک ہوجانا
رستم سے پہلواں سارے کہ وہ سب موت سے
ہارے
لحد میں کھود کر گاڑے کہ آخر خاک ہوجانا
لذت کا کھاوتے کھانا پہرتے ریشمی بانا
انھوں کو موت نے بھانا کہ آخر خاک ہوجانا
جنھوں گھر جھولتے ہاتھی، ہزاروں رین دن ساتھی
تنوں کوں خاک اب کھاتی کہ آخر خاک ہوجانا

کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ اشعار واقعتاً الحاقی ہیں۔ خاص طور سے زبان کی صفائی اس کی قدامت کو اشتباہ میں ڈالتی ہے لیکن جو شخص لسانی اعتبار سے نہایت تجربہ پسند اور مختلف اسالیب پر قادر ہو اس کے لیے یہ دشوار ہے کہ وہ ایک ایسی زبان میں کلام پیش کرسکتا ہے جو عرف عام میں بعد کے عہد کے لہجے سے مماثلت رکھے، اردو شاعری پر جعفر زٹلی کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ اس نے شمالی ہندوستان میں لسانی تجربہ پسندی کا ایک ماحول بنایا اور اردو شاعری کو ایک تشکیلی دور میں استحکام عطا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ جمیل جالبی بجا طور پر جعفر زٹلی کو اردو کا ایک دبستان تصور کرتے ہیں۔ ان کا بیان ملاحظہ ہو:

"جعفر نے نظم و نثر دونوں میں ہجو وطنز اور ہزل کی روایت قائم کر کے اسے آگے بڑھایا کہ وہ خود اس دبستان کا منفرد نمائندہ بن گیا۔ یہ روایت اس کے دور ہی میں نہیں بلکہ آنے والے دور میں بھی مقبول و قائم رہی۔ اس نے موضوعات، لہجے اور طرز بیان کے اعتبار سے اردو کی ہجو یہ شاعری کو بھی متاثر کیا ہے۔ اردو کے بڑے ہجو نگار مرزا رفیع سودا کے موضوعات اور لہجے پر جعفر کا اثر نمایاں ہے۔ رنگین کی شاعری اور نثر پر بھی جعفر کا اثر واضح ہے۔"

جعفر زٹلی کے علاوہ اس عہد میں کم از کم دو ایسے فارسی گو شعرا کے نام سے منسوب اردو کلام دستیاب ہے جن کا ادبی پایہ اس معیار کا نہیں ہے جو ان کی ادبی شخصیت کے ہم پلہ ہو۔ مرزا عبدالقادر بیدل اور سراج الدین علی خاں آرزو فارسی زبان و ادب کے حوالے سے ایسی نمایاں شخصیتیں ہیں جن کی خدمات کا اعتراف ہمہ گیر ہے۔ بیدل شاعر کی حیثیت سے اور آرزو زبان داں اور عالم کی حیثیت سے معروف ہیں۔ مرزا عبدالقادر بیدل (وفات 1720) کے ایسے شاگرد خاصی تعداد میں ہیں جو فارسی کے ساتھ اردو میں بھی اشعار کہتے تھے۔ بیدل ایسے شعرا کی اصلاح فرماتے تھے۔ شاید اپنے شاگردوں سے ہی تحریک پا کر انھوں نے اردو میں ضمنی طور پر ہی سہی لیکن شعر گوئی کی۔ مختلف تذکروں اور بیاضوں میں بیدل کی ایک غزل کے پانچ اشعار ملتے ہیں۔

ملاحظہ کیجیے:

مت پوچھ دل کی باتیں، وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
موجوں کی زد میں آئی جب کشتی تعین
بحر فنا پکارا ساحل کہاں ہے ہم میں
خارج نیں کی ہے پیدا تمثال آئینے میں
جو ہم سیں ہے نمایاں داخل کہاں ہے ہم میں
سوز نہاں میں کب کا وہ خاک ہو چکا ہے
اب دل کو ڈھونڈتے ہو اب دل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پے عشق آن کے پوکارا
پردے سیں یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے اس غزل کے اشعار سے متعلق بعض شبہات کا اظہار یوں کیا ہے:

"اس دور میں اتنی زبان کی صفائی دیکھ کر شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ نیز بیدل کا یہ اپنا رنگ بھی نہیں ہے۔ بہ ہر حالت تمام قدیم تذکروں میں ان کو موجود دیکھ کر سرے سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

واقعتاً اس غزل کی زبان زیادہ قدیم نہیں معلوم ہوتی اور اس میں بھی وہ استادانہ رنگ دکھائی نہیں دیتا جو بیدل سے مخصوص ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس غزل کے مطلع اور مقطع کو میر اور قائم چاند پوری نے اپنے تذکروں میں نقل کیا۔ زبان کی سادگی کی وجہ سے جمیل جالبی کے ذہن میں بھی شبہات پیدا ہوئے لیکن عمومی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد انھوں نے بیدل کی شاعری کے بارے میں اپنا موقف ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

"یہ وہ زمانہ تھا کہ ریختہ کا رواج بڑھ رہا تھا اور فارسی گو بھی گاہے گاہے ریختہ میں شعر کہنے لگے تھے۔ اس غزل کی زبان صاف ہے۔ فارسی کا رنگ واثر نمایاں ہے لیکن اس میں وہ پختگی نہیں ہے جو میرزا بیدل کی فارسی غزلوں میں نظر آتی ہے۔ یہ صورت ان سب فارسی کے ریختہ گویوں کے ہاں یکساں ہے جو بنیادی طور پر فارسی میں شاعری کر رہے تھے۔ آرزو کی ریختہ کو دیکھ کر یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وہی صاحب دیوان شاعر اور فاضل اجل ہیں جن کی فارسی گوئی کا شہرہ سارے برعظیم میں پھیلا ہوا ہے۔ نئی روایت کی ابتدا اسی طرح ہوتی ہے لیکن بیدل کی اس غزل کو اس دور کی شاعری میں رکھ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں مزاجاً وہ رنگ سخن ہے جو شاہ گل کے ہاں نظر آتا ہے اور جو آئندہ دور میں مرزا مظہر کے زیر اثر ابھرتا ہے۔"

سراج الدین علی خاں آرزو دہلی کی ان ممتاز شخصیات میں سرفہرست ہیں جنھیں اٹھارویں صدی کی ابتدا میں اہالیان دہلی کے درمیان سب سے بڑی ادبی شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ آرزو فارسی زبان و ادب کے ہمہ جہت عالم تھے۔ ان کے آس پاس ریختہ گو شعرا کی نوجوان نسل جمع تھی۔ ان کی کتابوں اور رسائل سے فائدہ اٹھانے والوں کی بھی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ اردو کی نئی نسل کی تربیت کے دوران انھوں نے بھی ریختہ میں بعض اشعار کہے۔ مختلف تذکرہ نگاروں نے ان کے اردو اشعار نقل کیے ہیں۔ ڈاکٹر حسن احمد نظامی نے اپنی کتاب "شمالی ہند کی اردو شاعری میں ایہام گوئی" میں ان کے 27 اشعار نقل کیے ہیں۔ پانچ پانچ اشعار کی دو غزلیں، چار شعر کی ایک غزل اور بقیہ متفرق اشعار اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں۔ ان اشعار سے شاعر کی حیثیت سے آرزو کی جو شبیہہ بنتی ہے وہ ان کی استادی کے مقابلے کم تر ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ کے نقطۂ نظر سے آرزو کا یہ مختصر ادبی سرمایہ بیش قیمت ہے اور اس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اٹھارھویں صدی کا باکمال استاد آخر کیسے ان جذبوں کی ترجمانی اور لسانی سرگرمیوں کی طرف ملتفت ہوا۔ آرزو کے بارے میں محمد حسین آزاد نے کہا تھا "خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعوا پہنچتا ہے جو ارسطو کو فلسفہ و منطق پر" نورالحسن ہاشمی نے بھی بجا طور پر آرزو کی مرکزیت تسلیم کی ہے۔ وہ کہتے ہیں "اس دور میں مرکزی حیثیت سراج الدین علی خاں آرزو کو حاصل ہے۔ انھی کے فیض صحبت سے اس دور کا تقریباً ہر شاعر متاثر اور مستفید نظر آتا ہے۔"

اس طرح اٹھارھویں صدی کے ابتدائی عہد تک جب دہلی میں اردو

شاعری کا بول بالا ہوا، اس سے قبل کے ادبی منظرنامے کا ایک سرسری مطالعہ ہمیں کچھ نتائج اخذ کرنے کے لیے پابند کرتا ہے۔ جعفر زٹلی نے سماجی اور سیاسی شاعری کے لیے راہیں استوار کیں۔ سیاسی نظام کے حوالے سے تخلیق کار کو کیسا بے خوف ہونا چاہیے اس کا بھی جعفر کے یہاں ایک سلیقہ ملتا ہے۔ طنز شاعری کا بنیادی عنصر بن کر شعر کو سماجی عمل کے قریب پہنچا دیتا ہے۔ شاعری میں جب تک لفظوں سے کھیلنے کا کام نہیں لیا جائے گا اس وقت تک زبان کے تخلیقی امکانات اچھی طرح ابھر کر سامنے نہیں آسکتے۔ جعفر زٹلی کی شاعری آنے والی نسل کے لیے ایک مکمل لائحۂ عمل اور فکری نظام مرتب کرتی ہے۔

بیدل فارسی میں تصوف کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس کے وسیلے سے تصوف کو اردو شاعری میں جگہ ملی۔ ولی کے اثرات بھی دہلوی شعرا کی نئی نسل پر مرتب رہے تھے اور متصوفانہ خیالات کو آزمانے کے لیے بھی ایک نئی نسل مرزا عبدالقادر بیدل اور دوسرے لوگوں کی نگرانی میں تیار ہو رہی تھی۔ بیدل کے لغات نے ریختہ گو شعرا کو مستند الفاظ اور محاورات کی تربیت دی۔ کسی نئی زبان کے قائم ہونے میں یہ عوامل تاسیسی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں غزل صنف کے طور پر استناد حاصل کرتی ہے۔

شمالی ہندوستان میں اب نئی غزل کی آمد آمد ہے۔ ایہام گو، اصلاح زبان کے موید ین اور پھر عہد زریں کی ممتاز نسل اپنی ادبی توانائی کے ساتھ ابھرتی ہے۔ خسرو سے لے کر جعفر زٹلی، آرزو اور بیدل سب کے سب دہلوی بزم کے ایسے فکری نمائندے بن جاتے ہیں جن کے بعد دہلی میں اردو شاعری پروان چڑھتی ہے۔ پہلی نسل کے آتے ہی ہمیں یہ پتہ چل جاتا ہے کہ کچھ دنوں پہلے تک جو زبان اور شعرا طفل مکتب قرار دیے گئے وہی تربیت پانے کے بعد اب آفتاب نصف النہار بن کر چمکیں گے۔ اسی زمانے میں اردو غزل کا ایسا مستحکم فکری اور فنی نظام طے پایا جس کی بدولت یہ صدی عہد زریں قرار دی جائے گی۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu, Delhi University, Delhi

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی.کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پوری کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت -/149 روپے

ہندوستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی.آر. گیڈگل، پروفیسر ایم. صدیقی

ہندوستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہوگئے بلکہ اسی کے بعد ہندوستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے وہی صحیح معنوں میں ہندوستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت -/130 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد حسن فاروقی

طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما

مختلف علوم وفنون میں تخلیق کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے تخلیق کی کوئی ایسی حتمی تعریف نہیں کی جاسکتی جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ تخلیق کے دائرے کی وسعت کسی مسئلے کا کوئی انوکھا حل، کوئی ایجاد، مصوری کا کوئی شہ پارہ، کسی خوبصورت نظم کا وجود میں آنا، قانون میں کسی نئے نکتے کی اختراع، کسی موضوع پر غور وفکر کا نیا پہلو، سب کسی نہ کسی معنی میں تخلیقی عمل کے زمرے میں آتے ہیں۔

تمام ماہرین تعلیم تخلیقی صلاحیتوں کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں جتنے بھی تعلیمی کمیشن قائم ہوئے اور جتنی بھی تعلیمی پالیسیاں مرتب ہوئیں، ان سب میں بچوں کی اس صلاحیت کے فروغ پر خصوصی توجہ دینے کی سفارش کی گئی ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 1987 میں طفل مرکوز تعلیم کے ساتھ ایسی درس وتدریس پر زور دیا گیا ہے جو بچوں کی اس صلاحیت کو بلند پروازی عطا کرے۔

پرائمری اسکول میں داخلے کے وقت بچوں کی عمر تقریباً پانچ سال ہوتی ہے۔ یہ سارے بچے تجسس کی دولت سے مالا مال ذہنوں میں سوالات کا ہجوم لیے اسکول میں قدم رکھتے ہیں۔ وہ ہر چیز کے بارے میں جاننے اور اسے سمجھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اس مرحلے میں بچے عموماً ایسے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں جن میں تخلیق کا عنصر شامل ہو۔ وہ مختلف کھیل کھیلتے ہیں، گردوپیش پر متجسسانہ نظر ڈالتے ہیں، مختلف طریقوں سے اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے مختلف آوازیں نکالتے ہیں، نقلیں اتارتے ہیں، ڈراما کرتے ہیں۔

طلبہ کی ان تخلیقی صلاحیتوں کو پہچاننا اور انھیں جلا دینا تعلیم کا بنیادی مقصد ہے۔ لیکن ہمارے مدارس میں تعلیم کا یہ بنیادی مقصد غفلت کا شکار ہے۔ نظم وضبط کے نام پر بچوں پر مختلف پابندیاں اور بندشیں عائد کردی جاتی ہیں۔ ان پابندیوں کے نتیجے میں ان کی قدرتی تخلیقی صلاحیتیں ماند پڑنے لگتی ہیں اور ان کی تخلیقی حسیت سرد پڑنے لگتی ہے۔ چند مثالوں سے میں اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

جماعت میں استاد نے بچوں کو اپنے پسندیدہ جانور کی تصویر بنانے کی ہدایت دی۔ ایک بچے نے عجیب سی تصویر بنائی۔ سر ہاتھی کا اور دھڑ شیر کا۔ اپنی بنائی ہوئی تصویر کو اس نے ایک نام بھی دیا eletiger۔ یہ موقع تھا کہ استاد اس بچے کی قوت متخیلہ کی داد دیتے اور اس کی تخلیق کو سراہتے لیکن ستائشی کلمات کی بجائے استاد کی سرزنش بچے کے حصے میں آئی۔

دوسری مثال دیکھیے، کسی دیہات کے اسکول میں ایک چھوٹی سی بچی کھڑکی میں سے دیوار کے درخت کی شاخ پر شوخ رنگوں والے مرغ زریں (oriole) کو گھونسلہ بناتے ہوئے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی ہے۔ استاد اس کے قریب آتے ہیں۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہیں، بچی کو اسپیلنگ یاد نہ کرنے پر ڈانٹتے ہیں اور کھڑکی بند کردیتے ہیں۔ حالانکہ استاد کے لیے یہ بہترین وقت تھا کہ اسپیلنگ رٹانے کا معاملہ موخر کردیتے، جماعت کے تمام بچوں کو خاموشی سے کھڑکی کے پاس جمع کرتے اور انھیں اس منظر سے لطف اندوز ہونے کا سنہری موقع دیتے جو بچوں کو مشکل سے ملتا ہے۔ یہ دنیا سب سے بڑی درس گاہ ہے۔ استاد نے صرف کھڑکی نہیں بند کی بلکہ بچی کے لیے اس عظیم درس گاہ کا دروازہ بند کردیا۔

ایک اور مثال دیکھیے۔ استاد جماعت میں کشش ثقل کی معلومات دے چکے۔ ایک بچے نے اچانک سوال پوچھا "سر! اگر کشش ثقل نہ ہوتو کیا ہوگا؟" استاد اس غیر متوقع سوال پر شپٹا کر رہ گئے۔ استاد اگر بیدار مغز ہوتے تو اس دلچسپ سوال کو بحث کا موضوع بنا کر تمام بچوں کو دعوت دیتے کہ ہر ایک اس پر غور کرے اور اپنی رائے دے۔ بچے یقیناً بڑے شوق سے اپنے اپنے خیال کا اظہار کرتے اور اس طرح کئی نئی باتیں سامنے آتیں۔

یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جدید نفسیات نے انکشاف کیا ہے کہ تخلیقی صلاحیت کا ذہانت سے مربوط ہونا لازمی نہیں ہے۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ بہت ذہین افراد کی تخلیقی صلاحیت بھی اعلیٰ درجے کی ہو۔ یہ غلط فہمی بھی عام ہے کہ تخلیقی صلاحیت پر چند منتخب افراد کی اجارہ داری ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ یہ نعمت مختلف درجات میں ہر فرد میں موجود ہے۔ ہر بچہ ایک ناتراشیدہ ہیرا ہے اور کسی ایسے دستکار کی فنکارانہ مہارت کا منتظر ہے جو اسے تراش خراش کر گوہر آبدار بنادے۔ بچے کے لیے استاد ہی وہ جوہری ہے جو اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو پہچان کر اسے نکھار کر رنگ روپ عطا کرسکتا ہے۔

ماہرین کی رائے میں تخلیقی رجحان پیدا کرنے، تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دینے اور شخصیت سازی میں مندرجۂ ذیل پانچ عوامل اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

(1) ماحول سے اکتساب: استاد صرف کاغذ، قلم، تختۂ سیاہ اور کھریا کے استعمال سے بچے کی تخلیقی صلاحیت کو بالیدگی عطا نہیں کرسکتا۔ ہمارے آس پاس

آسانی سے دستیاب ہونے والے بے شمار وسائل موجود ہیں۔ استاد کے لیے ان کا استعمال ناگزیر ہے۔ مثلاً لکڑی، چمڑا، مٹی، رنگ، کٹھ پتلی، کھلونے، ماڈل، تصویریں، نقشے، چارٹ وغیرہ۔ ان وسائل کا ہنرمندانہ استعمال طلبہ میں تخلیق کا شعلہ روشن کرسکتا ہے اور انھیں اس قابل بنا سکتا ہے کہ وہ ماحول میں موجود چیزوں کے بارے میں اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کا آزادانہ اظہار کرسکیں۔

(2) ماحول کی حسیت: ماحول کی حسیت اور تخلیق میں گہرا تعلق ہے۔ ایک موسیقار سمندر کے کنارے یا جنگل سے گزرتے ہوئے مختلف آوازیں سنتا ہے۔ ان آوازوں کو وہ اپنے احساسات بلکہ اپنے وجود کا حصہ بنا لیتا ہے اور انھیں موسیقی میں ڈھال کر ایک لافانی دھن کی تخلیق کرتا ہے۔ یہ ماحول سے فیض اُٹھانے والے ایک سچے فنکار کی علامت ہے۔

اس کے برخلاف جدید تہذیب میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جو جنگل سے گزرتے ہیں لیکن پرندوں کی چہچہاہٹ نہیں سنتے، کار سے یا پیدل گھر لوٹتے وقت سورج کو غروب ہوتا دیکھتے ہیں، لیکن غروب آفتاب کا حسن انھیں دکھائی نہیں دیتا، ہلکی ہلکی بارش کے بعد سڑکوں پر پیدل چلتے ہیں لیکن ہوا کی تازگی اور مٹی کی سوندھی خوشبو اُن کے مشام جاں کو معطر نہیں کرتی۔ ایسے افراد جزوی طور پر ہی زندہ ہیں۔ ایک اچھا استاد اپنے کمرۂ جماعت میں طلبہ کو تجربات کے ذریعے دنیا کے قدرتی حسن سے ہم آہنگ رکھتا ہے اور مختلف سرگرمیوں کے ذریعے ان کی حسیت کو تقویت دیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ کلاس میں مختلف سرگرمیوں کا نظم کرتا ہے۔ مثلاً جماعت میں استاد کے لائے ہوئے ایک تھیلے میں مختلف چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ طلبہ صرف چھوکر انھیں شناخت کرتے ہیں، آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے ساتھیوں کی آواز پہچانتے ہیں کہ ان سے کون باتیں کررہا ہے، کلاس میں مختلف آوازیں پہچان لیتے ہیں مثلاً کرسی کا سرکنا، دروازے کا بند ہونا، کھڑکی کا کھلنا، بجلی کے بٹن کا آن ہونا، کتاب کے اوراق کا پلٹنا وغیرہ۔ اسی طرح طلبہ پھولوں کو ان کی خوشبو سے اور چیزوں کو سونگھ کر ان کی شناخت کرلیتے ہیں۔

تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ اس قسم کی مشقوں سے طلبہ کی حسی قوت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

(3) قوت متخیلہ: تخیل بچے کی جادوئی چھڑی ہے۔ تخیل وہ آنکھ ہے جو معلوم دنیا سے پرے دیکھتی ہے۔ وہ سرچ لائٹ ہے نامعلوم چیزوں کو روشنی میں لے آتی ہے۔ یہ تحقیقات و انکشافات کا ابتدائیہ اور تخلیق کا جز ولاینفک ہے۔ بہت سی حیرت انگیز ایجادات نے پہلے تخلیقی ذہن رکھنے والے افراد کے تخیل میں جنم لیا اور بعد میں حقیقت کا روپ اختیار کیا۔

سائنس اور ریاضی میں اس صلاحیت کی بڑی اہمیت ہے۔ اپنی زبردست قوت متخیلہ کے بغیر شاید آئنسٹائن نظریۂ اضافیت تک نہ پہنچ پاتا۔ کسی نے سائنس داں کی تعریف اس طرح کی ہے کہ سائنس داں وہ ہے جو ہوا میں سیڑھیاں تعمیر کرتا ہے اور ان پر چڑھتا جاتا ہے حالانکہ سیڑھی حقیقتاً وہاں موجود نہیں ہوتی۔

تخیل چیزوں کو ان خصوصیات کے ساتھ دیکھنے کی صلاحیت بھی ہے جو درحقیقت ان چیزوں میں موجود نہیں ہیں۔

بچوں کے تخیل کو تنوع اور رفتار عطا کرنے کے بہت سے طریقے ہوسکتے ہیں۔ مثلاً استاد سوال پوچھ سکتا ہے "اگر تختۂ سیاہ بول سکتا تو کیا کہتا؟"

یہ سوال بے شمار چیزوں کے بارے میں پوچھا جاسکتا ہے مثلاً کاغذ کا سادہ ورق، چرچراتا ہوا زینہ، بکس کا آخری چاکلیٹ، کسی پارٹی کے اختتام پر ٹوٹا ہوا برتن، کرکٹ کی میچ کی آخری گیند وغیرہ۔

موجودہ دور کے انسان نے اپنے ماحول پر جدید تہذیب کے ایسے نشانات ثبت کیے ہیں جنھوں نے ہماری جمالیاتی حس کو مجروح کردیا ہے۔ مادیت کے سیلاب میں دنیا کی قدرتی خوبصورتی اور حسن برباد ہورہا ہے۔ قدرتی دلکش نظاروں اور مقامات پر بڑی بڑی پختہ سڑکیں بن گئی ہیں۔ اشتہارات (ہورڈنگ) کی کثرت نے مناظر کو داغ دار کردیا ہے۔ صحراؤں اور جنگلوں میں بڑے بڑے ہوٹل، رقص و سرود اور جوئے کے کلب اور تفریح گاہیں بن گئی ہیں۔ فطرت کی آغوش میں سکون کی تلاش دشوار ہوتی جارہی ہے۔ ترقی کی دوڑ میں انسان نے شہروں کو کثیف، چشموں کو گدلا اور قدرتی ماحول کو پراگندہ کردیا ہے۔

اسکول میں بچوں میں یہ احساس پیدا کرنا چاہیے کہ کوئی بھی تخلیق، دنیا کو خوبصورت اور انسانی زندگی کو سکون و اطمینان دینے کے لیے ہوتی ہے۔ انھیں اپنی تخلیقی صلاحیت کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے مدارس میں نئی نسل کی تربیت اس طرح کرنا ہے کہ بڑے ہوکر وہ دنیا کو اس کا کھویا ہوا حسن لوٹا دیں۔

(4) تدریس برائے تخلیق: تدریس برائے تخلیق، تخلیقی صلاحیتوں کی بالیدگی، ترفع اور شخصیت سازی کا سب سے بڑا عامل ہے جو مختلف پہلو لیے ہوئے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موسیقی، مصوری، شاعری، ڈراما، سنگ تراشی اور مجسمہ سازی انسان کے تخلیقی جذبے کے اہم ترین مظاہر ہیں۔ یہ فنون ہماری جمالیاتی حس کی تسکین ہی نہیں کرتے بلکہ انسانی زندگی کو نیا رنگ روپ عطا کرتے ہیں اور اس کی معنویت سے ہمیں آشنا کرتے ہیں۔ لیکن تخلیق کو صرف ان فنون میں محدود سمجھ لینا اور دوسرے مضامین کو نظرانداز کردینا ناانصافی ہے۔

طے شدہ مقاصد کے تحت منصوبہ بند طریقے سے تخلیقی تدریس کو بنیاد بنا کر ہر مضمون کو تخلیقی صلاحیت کے اظہار اور اس کے ترفع کا وسیلہ بنایا جاسکتا ہے۔ سائنس کی مثال لیجیے۔ یہ مضمون صرف چیزوں مثلاً گرینائٹ اور لوہے کے خواص، بھڑوں اور شہد کی مکھی کی معلومات، جانوروں یا کیڑے مکوڑوں کے جسم کے مختلف حصوں یا درختوں، پھولوں کے نام رٹنے اور انھیں پہچاننے کا نام نہیں ہے۔ اس مضمون کا بنیادی مقصد بچوں میں سائنسی رجحان پیدا کرنا ہے اور یہ رجحان مختلف سرگرمیوں کے ذریعے پیدا کیا جاسکتا ہے۔

جماعت میں تخلیقی صلاحیتوں کے فروغ کے لیے مناسب ماحول تیار کرنا استاد کی ذمے داری ہے جسے وہ مختلف سرگرمیوں کا انعقاد کرکے پوری کرسکتا ہے۔ بے شمار سرگرمیوں میں سے کسی مخصوص مضمون کے تعین کے بغیر بعض سرگرمیاں یہ ہوسکتی ہیں:

☆ گروہی/ جماعیت سرگرمیاں مثلاً گروہی مباحثہ، سیر وتفریح۔
☆ بچوں کی مصوری، پینٹنگ، دستکاری کے نمونوں کی نمائش، سائنسی نمائش۔
☆ اسکول میں بچوں کی پارلیمنٹ کی تشکیل۔
☆ نقش دیوار، آرٹ گیلری، کوئز مقابلے، معمے حل کرنا۔
☆ تخلیقی صلاحیت رکھنے والے کسی سابق طالب علم کو گفتگو کرنے کی دعوت۔
☆ کمرے اور اسکول کی صفائی، باغ لگانا، پودے اُگانا۔
☆ طلبہ کا ایک دوسرے کا انٹرویو لینا۔
☆ سائنس کے مختلف آلات اور کھلونے بنانا، کاغذ کی مدد سے مختلف شکلیں بنانا۔
☆ ڈرامے کی ایک سچویشن کو الگ الگ انداز سے پیش کرنا۔
☆ کہانی سن کر اسے ڈرامے کی شکل میں پیش کرنا۔
☆ آس پاس کے مقامات کی مختصر معلومات حاصل کرنا مثلاً پولس اسٹیشن، میلے، بازار، راستے، دکانیں، قریب کے دیہات، سواریاں
☆ مختلف شکلوں کو پہچاننا مثلاً جانور، پھول، پودے، درخت، سواریاں وغیرہ۔ بچوں کو سماجی ذمے داریوں کا احساس دلانے کے لیے بھی سوالات کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً
☆ سواریوں کی بے تحاشہ بڑھتی ہوئی تعداد پر کس طرح روک لگائی جاسکتی ہے؟
☆ گھر سے اسکول آنے پر تمھیں کون سی پسندیدہ/ ناپسندیدہ چیزیں نظر آتی ہیں؟
☆ سڑک پر تمھارے سامنے کوئی حادثہ پیش آجائے تو تم کیا کروگے؟

طلبہ کی قوت تخیل کی بالیدگی کے لیے اس قسم کے عجیب اور غیر متوقع سوالات بھی کیے جاسکتے ہیں۔

☆ کیا ہوتا اگر..........

انگریز ہندوستان نہ آتے؟

حساب میں صفر کا ہندسہ نہ ہوتا؟

اردو زبان میں حروف تہجی نہ ہوتے؟

سوال کی ندرت، اُس کا غیر متوقع ہونا اور سوال جواب کا منفرد رویہ، تخلیقی سوال کا معیار مقرر کرتے ہیں۔ خیال رہے کہ ماضی کی بجائے مستقبل کے بارے میں سوالات تخیلی/تخلیقی جوابات کے متقاضی ہوتے ہیں۔

مذکورہ تخلیقی تدریس مروجہ تدریس کے لگے بندھے اصولوں اور طریقوں سے الگ ہوتی ہے۔ اس طریقے سے استاد درسی کتاب کی پابندی سے آزاد ہوکر تخلیقی رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ تدریس کی روایتی تکنیک میں ندرت، تنوع اور بہتری لانے کی کوشش کرتا ہے۔

تخلیقی تدریس، تخلیقی ذہن رکھنے والے اساتذہ کا کام ہے۔ ایسے اساتذہ کو تعلیمی لیاقت اور ان کی ذہانت سے نہیں بلکہ کلاس روم تدریس، انٹرویو اور ان کے تخلیقی رجحانات سے پرکھا جاتا ہے۔

انتظامیہ کے لیے دوسرا اہم مرحلہ اسکول میں ایسا تخلیقی ماحول پیدا کرنا ہے جس میں استاد کو اپنی تدریس میں جدت اور ندرت پیدا کرنے اور تجربات کرنے کے پورے مواقع حاصل ہوں۔ انتظامی سطح پر وہ خود بھی نئے نئے راستے تلاش کریں اور استاد کو مطلوبہ وسائل فراہم کریں۔ بچوں کی طرح اساتذہ میں بھی تخلیقی صلاحیتوں اور تدریسی مہارتوں کا خزانہ ہوتا ہے جس پر بعض غیر اہم قوانین و ضوابط کی بندشوں کی گرد پڑ جاتی ہے۔ اس پوشیدہ اور غیر استعمال شدہ خزانے کو استعمال میں لاکر انتظامیہ اپنے اسکول کے معیار کو رفعت عطا کرسکتا ہے۔

تخلیقی صلاحیتوں کے امکانات کی شعوری طور پر شناخت، فروغ اور ترفع کی کوشش نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کا بیش قیمت سرمایہ ضائع ہورہا ہے۔ اگر اساتذہ، انتظامیہ، سرپرست اور بچوں کے اردگرد کے ہوش مند افراد مشترکہ طور پر ایک مقصد کے تحت اس سرمایے کی حفاظت میں لگ جائیں تو یہ دنیا ویسی حسین و دلکش بن سکتی ہے جس کے ہم خواب دیکھتے ہیں کیونکہ یہی بچے مستقبل میں ان خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ❑❑❑

پتہ:
574, Belbaugh, Guruwar Ward,
Malegaon (Nashik)-423203

عطا خورشید

جامعات میں اردو تحقیق

موجودہ عہد کے اردو محققین میں ایک اہم نام پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کا ہے۔ یوں تو انھیں اقبالیات میں اختصاص حاصل ہے لیکن اس موضوع کے علاوہ بھی انھوں نے دیگر علمی و تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں۔ اسی ضمن میں ان کی ایک علمی کاوش ''جامعات میں اردو تحقیق: اردو زبان و ادب سے متعلق دنیا کی 81 جامعات کے سندی تحقیقی مقالات کی فہرست'' 2009 میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس تالیف میں 4474 ایم فل، ڈی فل، ڈی لٹ، ایم لٹ، پی ایچ ڈی اور زیر تحقیق مقالات کی فہرست پیش کی گئی ہے۔ تقریباً 15 صفحات پر مشتمل مرتب کا تحریر کردہ ''مقدمہ'' ہے جس میں وجہ تالیف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے موجودہ دور میں تحقیق، بالخصوص جامعات میں کی جانے والی سندی تحقیق کا جائزہ لیا ہے۔ یہ ''مقدمہ'' اردو کے ہر اس استاد کو پڑھنا چاہیے جو اپنی زیر نگرانی تحقیق کراتا ہے۔ مرتب چونکہ خود ایک محقق ہیں، اس لیے آج کے دور میں فن تحقیق کی جس قدر پامالی ہو رہی ہے اس کا مشاہدہ وہ خود کرتے ہیں۔ اس سے جو تکلیف انھیں پہنچتی ہے اس کا اظہار انھوں نے اپنے مقدمے میں کیا ہے۔ کہتے ہیں ''ہمارے ہاں معیار اس قدر پست ہوگیا ہے کہ حماقتوں پر بھی ڈگری مل جاتی ہے۔'' (صفحہ نمبر XXVII)۔ اسی طرح زندہ شخصیات پر کام کرانے کے سلسلے میں وہ اپنا تلخ موقف اس طرح ظاہر کرتے ہیں ''بہت سے اساتذۂ جامعات (بیش تر وہ جن کا علاقہ تحقیق سے زیادہ تنقید سے ہے) اور خصوصاً وہ فاضلین کرام جو نئی نئی جامعات میں اردو کی صدر نشینی پر متمکن ہوئے ہیں، انتظار کے قائل نہیں ہیں شاید اس لیے کہ ع عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب۔'' مقدمے کے آخر میں سندی مقالات کا احتساب کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''جب تک ایک بے لاگ چھلنی نہ لگائی جائے گی اور ''رعایتی نمبر'' دینے کا سلسلہ بند نہ کیا جائے گا، معیار مزید گرتا جائے گا اور اردو والوں کی جگ ہنسائی کا باعث ہوگا۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو کے سندی مقالات کا معیار کیوں گرتا جا رہا ہے؟ کیا اس کے ذمے دار صرف مقالہ نگار ہیں یا نگراں حضرات بھی ہیں؟ میرے خیال میں زیادہ ذمے داری نگراں حضرات کی ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر استاد پی ایچ ڈی کا نگراں ہو جائے گا؟ جامعات میں کوئی ایسی کمیٹی تشکیل دی جانی چاہیے جس میں اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ کون استاد نگراں بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کون نہیں۔ آج کل جامعات میں ایسے اساتذہ نگراں بن جاتے ہیں جنھوں نے زندگی میں کتاب تو درکنار ایک مضمون بھی تحریر نہیں کیا ہے۔ کیا ایسے اساتذہ نگراں بننے کا حق رکھتے ہیں؟

مرتب موصوف نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ سندی مقالات کے عنوانات کیسے ہونے چاہیے؟ کیونکہ مقالے کا آغاز وہیں سے ہوتا ہے۔ اگر بنیاد ہی کج ہوگی تو عمارت بھی کج ہی تیار ہوگی۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تاثر یا می رود دیوار کج

اردو میں Thesis کا ترجمہ ''تحقیقی مقالہ'' کیا جاتا ہے۔ یعنی ایسا مقالہ جس کی بنیاد تحقیق پر ہو یا اس میں تحقیقی بحثیں ہوں۔ لیکن آج کل بیشتر مقالات ایسے عنوانات پر لکھے جاتے ہیں جن میں تحقیق کا ذرا بھی عنصر نہیں ہوتا ہے۔ پورا مقالہ تنقید اور تنقیدی نظریات پر مشتمل ہوتا ہے مثلاً ''احمد فراز کی غزلوں کی جذباتی ساخت''، ''پریم چند کے افسانوں میں عورت''، ''کرشن چندر کے ناولوں میں نسوانی کردار'' وغیرہ وغیرہ۔

ہاشمی صاحب نے گیان چند جین کے حوالے سے نگراں کی کچھ خصوصیات بتائی ہیں۔ مثلاً ''اس کا مزاج تحقیقی ہو۔ اس نے خود تحقیق کی ہو اور اب بھی تحقیق کر رہا ہو۔ وہ جس موضوع پر کام کرائے، اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہو۔ اس کے پاس اسکالر کی راہ نمائی کے لیے کافی وقت ہونا چاہیے۔'' آج کے دور میں کتنے فیصد نگراں ایسے ہیں جن میں یہ ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں؟ یہی سبب ہے کہ روز بروز اردو تحقیقی مقالات کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا اس سلسلے میں تجزیہ حق بجانب ہے کہ ''موجودہ تحقیقی معیار کی خرابی کے ذمے دار وہ استاد ہیں جو جامعات میں ان مقالات کے نگراں ہیں اور خود فن تحقیق و تدوین کے اصول و مسائل سے نابلد ہیں۔''

ہاشمی صاحب یہ سفارش بھی کرتے ہیں کہ ان تحقیقی مقالات کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے گاہے بگاہے ان پر قاضی عبدالودود کی طرز کا تبصرہ بھی منظر عام پر آنا چاہیے، اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے سند یافتہ مقالات کے جائزوں پر تنقیدی تبصروں اور مباحثوں کا جو اہتمام کیا تھا (جس کی روداد مجلہ ''معیار و تحقیق''، پٹنہ، نمبر 2 میں شائع ہو چکی ہے) اسے جاری رکھنا چاہیے۔ اس کام کے لیے خود ماضی کی روایت کے مطابق خدابخش لائبریری پیش رفت کر سکتی ہے، نہیں تو انجمن ترقی اردو (ہند و پاکستان) یا مقتدرہ قومی زبان (اسلام آباد) کے پلیٹ فارم سے یہ کام ہو سکتا ہے۔

مقدمے کے بعد ''فہرست مآخذ اور مخففات'' ہے جس کے تحت 56 مآخذ

اور ان کے لیے استعمال کیے گئے مخففات الفبائی ترتیب سے دیے گئے ہیں۔ اس فہرست میں دو جگہ نظر رکتی ہے۔ سندی مقالات کی فہرست میں جابجا ''ف خاور'' کا حوالہ آیا ہے۔ ''ف خاور'' کیا ہے اس کے لیے جب مخففات کی فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کی تفصیل ''ف'' میں نہ رکھ کر ''خ'' یعنی ''خاور'' کے ذیل میں کی گئی ہے۔ اسی طرح جابجا ''ف قرطبہ'' کا حوالہ آیا ہے لیکن مخففات کی فہرست میں ''ف قرطبہ'' کہیں نہیں بلکہ ''ف ق'' لکھا ہے۔

مذکورہ بالا فہرست کے بعد اس کتاب میں استعمال کیے گئے ''علامات'' کی فہرست دی گئی ہے۔ اس کے بعد ان 81 جامعات کی فہرست ہے جن کے سندی مقالات کی بنیاد پر یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے۔ 81 جامعات میں سے 53 ہندوستان 15 پاکستان، ایک بنگلہ دیش اور بقیہ 12 دیگر ممالک کی جامعات ہیں۔ ان فہرستوں کے بعد اصل زیر بحث موضوع یعنی سندی مقالات کی فہرست کا نمبر آتا ہے جسے 5 موضوعات کے ذیل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پھر ان موضوعات کی ذیلی تقسیم بھی کی گئی ہے۔ پہلا باب ''تاریخ زبان و ادب'' پر ہے، دوسرا باب ''شاعری'' تیسرا باب ''نثر'' چوتھا باب ''شخصیاتِ ادب'' اور پانچواں باب ''متفرقات'' ہے۔

ہر باب کو مصنف وار یعنی مقالہ نگاروں کے نام کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مثلاً پہلے مصنف کا نام، مقالے کا عنوان، یونیورسٹی کا نام، سنہ (جب ڈگری تفویض ہوئی)، نگراں کا نام اور آخر میں حوالہ جہاں سے اطلاع حاصل ہوئی۔ صرف ''شخصیاتِ ادب'' کی ترتیب مقالہ نگاروں کے ناموں سے نہ کر کے تذکرۃ الیہ کے ناموں سے کی گئی ہے اور ان ناموں کو الفبائی ترتیب میں رکھا گیا ہے۔ سب سے طویل باب یہی ہے جو 76 صفحات پر محیط ہے۔ ان ابواب کے بعد ''نگراں اساتذہ''، ''کتب و رسائل''، ''شخصیات''، ''اماکن'' و ''متفرق عنوانات و موضوعات'' کے عنوان سے اشاریے دیے گئے ہیں۔ یہاں مقالہ نگاروں کے اشاریے کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اشاریے کے بعد ''ضمیمہ'' کے عنوان سے مزید ایسے 100 اندراجات دیے گئے ہیں جو کتاب کی ترتیب کے بعد حاصل ہوئے۔

پیش نظر فہرست میں کل 4474 اندراجات (ضمیمہ میں شامل 100 اندراجات کی شمولیت کے بعد) درج ہیں۔ کوشش کی جاتی تو ان اندراجات کی تعداد میں مزید اضافہ ہوسکتا تھا۔ بعض اندراجات کی تکرار ہوگئی ہے۔ اگرچہ آخری صفحے پر ''تصریحات'' کے عنوان سے ایسے دس اندراجات کی نشاندہی کردی گئی ہے اور انھیں قلم زد کرنے کی قارئین کو ہدایت بھی کی گئی ہے لیکن ان دس اندراجات کے علاوہ بھی خاصے ایسے اندراجات ہیں جو مقالہ نگاروں کے ناموں کی ذرا سی ترتیب اُلٹ جانے کے سبب یا عنوان کے ابتدائی لفظ میں ذرا سی تبدیلی کی وجہ سے یا دو مآخذ سے حوالہ لینے کے سبب مکرر ہوگئے ہیں۔ مثلاً نمبر 1292 (ابوالفیض عثانی و عثانی، اے. ایف: راجستھان میں اردو زبان و ادب کے لیے غیر مسلم حضرات کی خدمات)؛ نمبر 22 و 182 (ایس ایم معزالدین و محمد معزالدین، سید: عظیم آباد میں اردو)؛ نمبر 448 و 672 (طاہر مسعود خاں و اطہر مسعود خاں: نیا دور لکھنؤ کا اشاریہ 1900 تا 2001 و نیا دور لکھنؤ 1955 تا 2001؛ صحیح نام اطہر مسعود خاں)؛ 502 و 607 (ناصرہ بتول: نوراللغات (حصہ اول و دوم) کی تدوین مع مقدمہ و نوراللغات (حصہ سوم و چہارم) کی تدوین مع مقدمہ؛ دونوں موضوع ایم فل کے لیے اور دونوں زیر تحقیق)؛ 575 و 3416 (قریش حسین: کلیات حضرت رکن الدین عشق (عشق؟) و قریشہ حسین: شاہ رکن الدین عشق عظیم آبادی: حیات اور شاعری؛ صحیح نام قریشہ حسین)؛ 1866 و 1668 (گلزار یاسمین و گلناز یاسمین: اردو میں خواتین کی شعری خدمات)؛ 1748 و 1966 (شہاب الدین، قاضی: اردو میں میلادنامے)؛ 2015 و 2028 (ظفر اقبال و مظفر اقبال: بہار میں اردو نثر کا ارتقا: 1857 سے 1914 تک؛ صحیح نام مظفر اقبال)؛ 2248 و 2277 (سعود جامعی و مسعود جامعی: اسٹیج کا فن؛ صحیح نام مسعود جامی)؛ 2456 و 2471 (برکت علی و محمد برکت علی: سفرنامہ اور اردو سفرنامے: 1901 تا 1975)؛ 2658 و 3413 (صدرالدین فضا و محمد صدرالدین فضا: آیت اللہ جوہری: حیات اور شاعری)؛ 2816 و 3410 (طلحہ رضوی برق و محمد طلحہ رضوی برق: اکبر وانا پوری: حیات اور شاعری)؛ 3352 و 3962 (زرغونہ کنول: اردو شعر و ادب کے فروغ میں مجلّہ سویرا اور محمد سلیم الرحمٰن کی خدمات: ایک جگہ محمد سلیم الرحمٰن کے ذیل میں اور دوسری جگہ سلیم الرحمٰن کے تحت)؛ 3418، 3566 و 3569 (قاسم احسن محمد، قاسم احسن وارثی و محمد قاسم احسن وارثی: شاہ ظہورالحق ظہور پھلواروی: حیات اور شاعری)؛ 3686 و 4161 (محمد انصاراللہ نظر: میر علی اوسط رشک: حیات اور ادبی خدمات؛ ایک جگہ علی کے تحت جبکہ دوسری جگہ میر کے ذیل میں)۔

یوں تو اس کتاب میں اردو زبان و ادب سے متعلق سندی تحقیقی مقالات کی فہرست'' پیش کرنے کی بات کہی گئی ہے لیکن اردو کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں لکھے فارسی کتابوں پر مقالات بھی اس میں درج ہوگئے ہیں۔ مثلاً 223 (چودھویں صدی عیسوی میں صوفیائے بہار کے ملفوظات)؛ 470 (ترابی اور تدوین و ترتیب دیوان)؛ 872 (پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مع مسافر: فکری و فنی جائزہ)؛ 1027 (زبور عجم میں تشبیہات کا جائزہ)؛ 1440 (مرزا ابوطالب کی خلاصۃ الافکار کا تنقیدی مطالعہ)؛ 2902 (حضرت احمد لنگر دریا بلخی کی حیات، شاعری اور ملفوظات کا تنقیدی جائزہ)؛ 2903 (احوال و آثار حضرت نوشہ حسین توحید بلخی: تدوین دیوان فارسی مع نقد و تبصرہ)؛ 2917 (مرزا عبدالقادر بیدل)؛ 4228 (شاہ نورالحق تپن (تپاں؟)؛ 3460

(شرف جہاں: حیات اور تصانیف)؛ 3479 (احوال و آثار شمس الدین حسین عاجز مع ترتیب و تحشیہ کلیات)؛ 3601 (احوال و آثار و افکار عبدالحمید پریشاں)؛ 3756 (حکیم رکن الدین فصیح کاشی: حیات اور کارنامے)؛ 4115 (موہن لال انیس اور ان کا تذکرہ)؛ 4304 (حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی نثری تخلیقات کا انتقادی ولسانی مطالعہ) وغیرہ۔

موضوعات کے انتخاب میں تنوع تو رکھا گیا ہے لیکن ترتیب میں بے ضابطگی نظر آتی ہے۔ مثلاً رسائل کے اشاریوں کا اندراج ''حوالہ جاتی مقالے'' کے تحت بھی ہے اور ''رسائل'' کے خانے میں بھی علیحدہ علیحدہ درج ہے۔ یا تو ان سارے اشاریوں کو صرف ''حوالہ جاتی مقالے'' کے ذیل میں رکھا جاتا یا دونوں جگہ یعنی ''رسائل'' کے خانے میں بھی رکھا جاتا تا کہ دو طرفہ حوالے (Cross Reference) کی صورت میں استفادے کی صورت آسان ہوجاتی۔ اسی طرح ''شاعری۔ مجموعی مطالعہ'' کے تحت ایسے عنوانات بھی ہیں جن کی مناسب جگہ ''تاریخ زبان وادب'' یا ''تذکرے'' تھی۔ مثلاً نمبر 1527 (راجستھان میں اردو شاعری کا ارتقا: 1900 تک)؛ 1529 (اردو شعر وادب کے ارتقا میں لکھنؤ کے ہندو شعرا کا حصہ)؛ 1532 (شاعرات بنگال: حیات اور کارنامے)؛ 1451 (گلبرگہ میں اردو شاعری 1957 تا حال)؛1543 (پنجاب میں اردو شاعری کا ارتقا)؛1552 (نواب غلام غوث خاں اعظم کے عہد میں اردو زبان و ادب کا ارتقا)؛ 1557 (اردو شعرا کے تذکروں کا انسائیکلوپیڈیا)؛ 1559 (ولی سے قبل دکن میں اردو شاعری کا ارتقا)؛ 1561 (گلبرگہ میں اردو شاعری کا ارتقا؛ عہد بہمنی تا حال)؛ 1583 (اردو شاعری کے فروغ میں علی گڑھ کا حصہ 1947 تک)؛ 1593 (حیدرآبادی شاعرات 1947 کے بعد)؛ (حیدرآبادی شاعرات 1947 کے بعد)؛ 1595 (سندیلہ کے مشاہیر شعرا)؛ 1596 (ایلچ پور کے بعض قدیم شعرا کی حیات اور کارنامے)؛1603 (جنگ آزادی کے اردو شعرا)؛1604 (سندھ میں اردو شاعری کا ارتقا)؛ 1609 (لکھنؤ کی اردو شاعری 1900 تا 1947)؛ 1614 (راجن پور، بہاول پور اور ڈیرہ غازی خاں کے قدیم اردو شعرا: آغاز سے 1990 تک)؛ 1609 (لکھنؤ کی اردو شاعری 1900 تا 1947)؛ 1614 (راجن پور، بہاول پور اور ڈیرہ غازی خاں کے قدیم اردو شعرا: آغاز سے 1990 تک)؛ 1615 (اردو شاعری کی ترقی میں شعرائے آرہ کا حصہ)؛ 1619 (پاکستان کی نمائندہ اردو شاعرات: 1973 تا حال)؛ 1621 (راجستھان کے اردو شعرا)؛ 1629 (گجرات کے اردو شعرا)؛ 1644 (لاہور کا دبستان شاعری)؛ 1654 (پنجاب میں اردو شاعری کا ارتقا: 1901 تا 1947)؛ 1658 (مراٹھواڑا کی نظم گو خواتین شاعرات: آزادی کے بعد)؛ 1662 (بہار میں اردو شاعری کا ارتقا: 1858-1914)؛ 1675 (اردو کے قدیم پشتون شعرا)؛ 1699 (جنگ آزادی کے اردو شعرا: 1857 تا 1947)؛ 1705 (دربھنگا میں اردو شاعری کا ارتقا)؛ 1758 (بیسویں صدی میں اردو کے غیر مسلم نعت گو شعرا)؛ 4173 (ناسخ اور ان کے تلامذہ)؛ 1474 (بہار کے تلامذہ ناسخ) وغیرہ۔

محولہ بالا ساری کمیاں اور خامیاں دور ہوسکتی تھیں اگر آخر میں دیے گئے اشاریے پر محنت کی جاتی۔ مقالہ نگاروں کا اگر اشاریہ بھی اس میں شامل ہوتا تو ناموں کی تکرار سے بچا جاسکتا تھا۔ عنوان کا بھی اگر ایک الفبائی اشاریہ ہوتا تو عنوانات کی تکرار سے بھی بچا جاسکتا تھا۔ موضوعات کے اشارے میں اگر یہ شق نہ رکھی جاتی کہ متن میں موجود موضوع کو چھوڑ کر دیگر ابواب میں شامل موضوعات کو شامل کیا گیا ہے تو اشاریے میں شترگربگی بھی نہ آتی۔ مثلاً انعام اللہ خاص یقین پر کیے گئے کام کو تلاش کیا جائے تو ''شخصیات ادب'' کے ذیل میں ایک اندراج انعام اللہ کے تحت ''الف'' کے ذیل میں (نمبر 2853) اور دوسرا اندراج یقین کے تحت ''ی'' کے ذیل میں (نمبر 4309)۔ ظاہر ہے کہ دونوں کو ایک ہی جگہ ہونا چاہیے۔ تیسرا اندراج نمبر 571 پر دیوان یقین کے ذیل میں ہے، جس کا ذکر ''اشاریہ: شخصیات'' میں موجود ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ کتاب میں کسی بھی باب میں اس کا ذکر ہوتا، اشاریے میں ''یقین'' کے ذیل میں اس کا ذکر ایک جگہ کر دیا جاتا تو استفادہ کرنے والوں کے لیے آسانی ہوجاتی۔ ایک دوسری مثال ''حسنین عظیم آبادی'' کی ہے کہ ایک اندراج ''حسنین عظیم آبادی'' کے ذیل میں ہے (نمبر 3108) جبکہ دوسرا اندراج ''محمد حسنین'' کے ذیل میں ہے (نمبر 3954) دونوں کو ایک جگہ رکھنا چاہیے تھا۔

نگراں اساتذہ کے اشاریے میں بعض ناموں کے دو دو جگہ اندراج ہوئے ہیں۔ مثلاً ابوالخیر کشفی، مسعود حسین خاں، بعض جگہ ایک شخص کو دو علیحدہ علیحدہ شخصیت بنا کر انھیں اشاریے میں شامل کیا گیا ہے جبکہ وہ ایک ہی شخصیت ہیں۔ مثلاً رشید احمد گوریچہ اور رشید گوریچہ؛ رفیق حسین اور رفیق حسین سید؛ ریاض احمد اور ریاض احمد ریاض؛ سعید احمد اور سعید احمد رفیق؛ سلطانہ بخش اور سلطانہ بخش محمدی؛ شاہ عطاء الرحمٰن اور عطاء الرحمٰن کاکوی؛ صدرالدین، صدرالدین شمسی اور صدرالدین فضا؛ صغیر بیگ اور محمد صغیر بیگ؛ علیم اللہ اور علیم اللہ حالی؛ کوکب قدر اور مرزا کوکب قدر؛ محمد اسماعیل او محمد اسماعیل آزاد؛ محمد یوسف بخاری اور یوسف بخاری؛ محمد یوسف کوکن اور یوسف کوکن؛ مسعود حسن رضوی اور مسعود حسن رضوی ادیب۔

محولہ بالا کمیوں اور خامیوں کے باوجود یہ فہرست ایک اچھی علمی کاوش ہے۔ اردو کے تحقیقی میدان میں کس طرح کوتاہیاں ہوتی رہتی ہیں وہ پہلی بار منظر عام پر آئی ہیں۔ لاعلمی کی بنا پر ایک ہی موضوع پر عنوان میں الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ بھی تحقیق کرائی گئی ہے۔ چند مثالیں (ہندوستان کی

یونیورسٹیوں کی حد تک) ملاحظہ ہوں: نمبر 49, 65, 148, 176, 210 (اردو میں بچوں کا ادب یا ادب اطفال۔ جامعہ ملیہ، رانچی -86، گلبرگہ -94، ناگ پور، میرٹھ 84)؛ نمبر 67, 93, 122, 191 (تامل ناڈو میں اردو۔ بمبئی مدراس یونیورسٹی)؛ نمبر 134, 192 (مستشرقین اور اردو۔ جواہر، کشمیر)؛ نمبر 32, 140 (راجستھان میں اردو۔ اودے پور، راجستھان)؛ 119, 202 (ممبئی میں اردو۔ ممبئی-61)۔

اس فہرست سے یہ دلچسپ اطلاع بھی ملتی ہے کہ ایک ہی طالب علم نے ایک ہی نگراں کی نگرانی میں عنوان میں بغیر کسی رد و بدل کے ایک ہی موضوع پر پہلے ایم فل پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ مثالیں ملاحظہ فرمائیں: نمبر 1117 و 1118 (اقبال اور ہیومنزم۔ نگراں: آل احمد سرور)؛ نمبر 1180 و 1181 (اقبال اور کشمیر۔ نگراں: آل احمد سرور)؛ نمبر 1242 و 1243 (اقبال اور سوشلزم۔ نگراں: کبیر احمد جائسی)؛ 2375 و 2376 (اردو ناول میں المیہ عناصر۔ شکیل الرحمٰن)۔

اس فہرست کی تیاری میں بلاشبہ خاصی محنت کی گئی ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی مرتب موصوف کو تسلیم کر لینی چاہیے کہ یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ یہ ابھی مزید محنت، توجہ اور تلاش چاہتی ہے بہتر ہو کہ مرتب موصوف تلاش و جستجو جاری رکھیں اور اپنے تعلقات کی بنیاد پر ہر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے براہ راست رابطہ قائم کر کے ان سے وہاں کی تحقیقی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ اس طرح کی سرگرمیوں کی روداد شعبے کے مجلات اور دیگر علمی رسالوں میں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً ''اردو بک ریویو'' (دہلی)، ''اخبار اردو'' (اسلام آباد)، ''نقطۂ نظر'' (اسلام آباد)؛ ہفتہ وار ''ہماری زبان'' (دہلی) وغیرہ۔ اگرچہ مرتب موصوف نے محولہ بالا رسالوں میں شائع ہونے والی فہرستوں سے مدد لی ہے، جس کا حوالوں میں ذکر بھی آیا ہے لیکن غالباً ان رسالوں کی مکمل فائل انھیں نہیں مل سکی ہے، جس کے سبب بہت سی فہرستوں تک ان کی رسائی نہیں ہو پائی۔ مثلاً ''بہار کی دانش گاہوں میں اردو تحقیق: آغاز سے 1991 تک'' مرتبہ ڈاکٹر سید شاہد اقبال، مطبوعہ ''اخبار اردو'' (اسلام آباد)، دسمبر 1991، جنوری و فروری 1992، (3 قسطیں)؛ ''گدھ یونیورسٹی میں اردو تحقیق: 1997 تا حال'' مرتبہ ڈاکٹر شاہد اقبال، مطبوعہ ''مشام 2004'' (شعبۂ اردو، گدھ یونیورسٹی کا مجلہ)؛ ''فہرست پی ایچ ڈی: بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفر پور، بہار'' مرتبہ ڈاکٹر سید آل ظفر حسینوی، مطبوعہ ''اردو بک ریویو'' (دہلی)، جولائی اگست 1999؛ ''ایم اے اردو کے تحقیقی مقالات: جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد) 1934 تا 1976'' مرتبہ م.ق. سلیم، مطبوعہ ''اردو بک ریویو'' نومبر دسمبر 2004؛ ''شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج لاہور ایم اے کے مقالات'' مرتبہ ڈاکٹر معراج نیر، مطبوعہ ''تحقیق نامہ'' (شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، لاہور) 95-1994 وغیرہ۔

اردو کے طلبہ و اساتذہ ممنون ہوں گے اگر مرتب موصوف اس فہرست پر نظر ثانی کریں اور اس کا دوسرا ایڈیشن مزید اہتمام کے ساتھ شائع کریں، تاکہ اسے ایک دستاویزی حیثیت حاصل ہو جائے۔

□□□

پتہ:
4/1711-F, Muzammil Manzil Compuond,
Behind Zakir Husain School,
Dodhpur, Aligarh-202002, U.P.

کلیات راجندر سنگھ بیدی — جلد اول، جلد دوم

مرتب: وارث علوی

کلیات راجندر سنگھ بیدی کی پہلی جلد میں افسانے اور دوسری جلد میں بیدی کے ناولٹ، ڈرامے، مضامین، انشائیے، خاکے، خطبے، دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچے، تبصرے، تاثرات، تنقیدیں اور مختلف ادبی شخصیات کو لکھے گئے 31 خطوط ہیں۔ جلد اول میں مرتب نے راجندر سنگھ بیدی کی زندگی اور شخصیت کے علاوہ بیدی کے افسانوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کے ساتوں مجموعے — دانہ و دام، گرہن، کوکھ جلی، اپنے دکھ مجھے دے دو، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، مکتی بودھ اور اس کے علاوہ بیدی کے وہ افسانے بھی شامل ہیں جو ان کے کسی مجموعے میں نہیں ہیں۔ دوسری جلد میں ان کے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' اور ان کے ڈراموں کے دونوں مجموعے — بے جان چیزیں اور سات کھیل جن میں گیارہ ڈرامے ہیں۔ اس دوسری جلد میں بیدی کے فن پر وارث علوی کا مضمون ان کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

جلد اول: صفحات : 1040، قیمت : -/525 روپے/ جلد دوم: صفحات: 655 قیمت : -/380 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

آفتاب احمد آفاقی

لکشمن ریکھا کے پار: ایک مطالعہ

الیاس احمد گدی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ایک فکشن نگار کی حیثیت سے کیا اور افسانے اور ناول لکھنے کے ساتھ ساتھ ایک سفر نامہ ''لکشمن ریکھا کے پار'' اور آپ بیتی بھی لکھی۔ انھیں ناول ''فائر ایریا'' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ ان کی خودنوشت ''مگدھ پوری کا داستان گو'' اور سفر نامہ پر اب تک خاص توجہ نہ دی گئی۔ حالانکہ یہ دونوں ہی چیزیں اہم ہیں، خاص کر ان کا سفرنامہ ''لکشمن ریکھا کے پار'' ایک شاہکار ادبی تخلیق کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ سفر نامہ 1968 میں ان کے مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) کے سفر کی روداد ہے۔ یہ سفرنامہ پہلی مرتبہ 1998 میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان کی تخلیقی کاوشوں میں فکری اعتبار سے خاصی مماثلت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک مخصوص علاقے اور اس کی لہولہان زندگی اور اس کے مسائل ان کے پیش نظر رہے ہیں۔

''فائر ایریا'' میں اگر جھریا اور دھنباد کے کوئلہ مزدوروں کی پامال زندگی کی عکاسی کی گئی ہے تو ''لکشمن ریکھا کے پار'' مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کا ایک ایسا مرقع ہے جس سے قاری کو وہاں کے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور معاشرتی حالات اور رجحانات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ تخلیق اپنے بیانیہ اسلوب، ماحول آفرینی، حسین اور دلکش انداز بیان کی وجہ سے بے حد دلچسپ ہوگئی ہے۔

تقسیم ہند کے نتیجے میں برصغیر میں جو فسادات کی لہر اٹھی اس نے پنجاب اور دہلی کے علاوہ ملک کے طول وعرض میں پھیلی آبادی کو شدید طور پر متاثر کیا۔ مشرقی اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال کے متاثرہ علاقوں کے افراد نے بڑی تعداد میں اپنے گھر بار اور جانوروں کو اونے پونے فروخت کر کے مشرقی پاکستان کا رخ کیا اور کھلنا سعید پور، ڈھاکہ وغیرہ شہروں میں آباد ہوگئے۔ ہجرت کا یہ سلسلہ زیادہ تر غیر قانونی تھا، امن اور بہتر زندگی کی تلاش کی غرض سے ہجرت کے اس عمل نے سیاسی، معاشی اور تہذیبی سطح پر ایک ایسے خوف و دہشت کو بھی جنم دیا جس کے اثرات آج بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

سفر نامہ اصلاً مشاہدات اور تجربات کا بیان ہے جو کسی شخص کو سفر کے درمیان پیش آتے ہیں۔ اس میں کسی مقام، ماحول، فضا اور منظر کی مرقع کشی کے ساتھ تہذیبی اور معاشرتی زندگی پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور ایک ایسی جیتی جاگتی اور دلکش فضا پیدا کی جاتی ہے جس میں اشخاص اور مقامات ایک مخصوص ندرت اور انفرادیت کے حامل نظر آنے لگتے ہیں اور ان میں بصیرت اور معنویت کے نئے گوشے ابھر آتے ہیں۔ سفر نامے کی ان خصوصیات کی روشنی میں متذکرہ سفر نامہ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی قدر و قیمت متعین کرنے میں آسانی ہوگی۔

الیاس احمد گدی نے سب سے پہلے اپنے سفر کے پس منظر کو پیش کیا ہے اور آغاز سفر کے محرکات پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔ سفر کی پہلی وجہ اپنے رشتہ داروں سے ملاقات بتائی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ بنگال کے قدرتی مناظر، رومانی فضا اور بھٹکی گیتوں میں رچا بسا اور مرشدی نغموں میں نہایا یہ علاقہ مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کے غور وفکر کا مرکز رہا ہے۔ صہبا لکھنوی نے ''میرے خوابوں کی سرزمیں'' میں اور قرۃ العین حیدر نے 'آگ کا دریا' میں اس علاقے کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ الیاس احمد گدی کو بھی Provok کرتا ہے۔ اسی علاقے کی ندی میں ناؤ کھیتے ہوئے المعصور کو اپنے انگریز آقا کی بید برداشت کرنا پڑتی تھی۔ غلامی کے خوف اور ندامت کے سبب وہ سر اٹھانے سے قاصر تھا۔ الیاس احمد گدی ایک آزاد ملک میں یہ جاننے کے خواہشمند ہیں کہ ''المعصور کیا آج بھی ویسا ہے؟ کیا اس میں کوئی تبدیلی نہیں''، الیاس احمد گدی کا یہ جملہ بے حد بلیغ ہے، المعصور میں تبدیلی کی خواہش انقلاب کی علامت ہے جو ''فائر ایریا'' میں ختو نیا کی شکل میں نظر آتی ہے۔

الیاس احمد گدی نے مشرقی پاکستان کا یہ سفر، جو غیر قانونی اور جوکھم بھرا تھا، اور جسے اس علاقے کے لوگ بذریعہ گردنیا پاسپورٹ کہتے ہیں، اپنے دوست صادق کے ہمراہ الطاف نامی ایجنٹ کی رہنمائی میں خشکی اور دریائی، دونوں راستوں سے رات کی تاریکی میں طے کیا۔ جمشید پور سے مغربی بنگال کی سرحد تک پہنچنے میں ہر قدم پر مقامی غنڈوں، مخبروں، پولیس اور ایجنٹوں کے خطروں نے امتحان میں ڈالا۔ پہلے یہ سفر جمشید پور سے سیالدہ اور پھر مرشدہ آباد بذریعہ ریل طے کرنا تھا، لیکن پکڑے جانے کے خوف سے ایسا ممکن نہ ہوسکا، لہٰذا زنگی پور کے راستے پیدل، ریل اور بس کی مدد سے سرحد تک پہنچنے کی ترکیب اختیار کی گئی۔ سفر کے دوران ملنے والے گاؤں قصبات اور شہروں کی تفصیلات کا بیانیہ، ڈرامائی اور شاعرانہ اسالیب میں پیش کیا ہے اور اپنے تخلیقی جوہر سے اس علاقے کے تاریخی و معاشرتی واقعات میں رنگ بھر دیا ہے نیز کھیت کھلیان، گلیوں، بازاروں، دریاؤں اور حسن فطرت کے بیان کے پہلو بہ پہلو تخلیقی نقوش کو انھوں نے بہ خوبی اجاگر کیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ٹرین کی کھڑکی، لگتا تھا ٹیلی ویژن اسکرین جس پر وسیع مناظر ہر لحہ بدل رہے ہیں...... کٹے ہوئے کھیت پوال کی گول ڈھیریاں، چھوٹے چھوٹے گاؤں، ہریالی، چمکیلے پانی والے تالاب، چھوٹی ندیاں اور پھر قریب سے

چھوٹے گڑھے جو مربع یا مستطیل کی صورت میں کٹے ہوئے تھے اور جن میں برسات کا پانی ابھی بھی جمع تھا جس کے متعلق ایڈمیرل واٹسن نے سراج الدولہ سے کہا تھا...... میں تمھارے ملک میں ایسی آگ لگاؤں گا، جسے سات دریاؤں کا پانی بھی نہ بجھا سکے گا، اور واقعی اس نے ایسی آگ لگائی، اس نے چھوٹے زمینداروں کو راجہ کے خطاب سے نوازا اور مارواڑیوں کے ہاتھوں میں سرمایہ داری کی مشعلیں تھما کر ان کے ساتھ کر دیا۔ ان مارواڑیوں اور راجاؤں نے اپنے آقاؤں کے اشارے پر ایسی آگ لگائی کہ سارا بنگال جل کر راکھ ہوگیا۔'' ص-16

یہاں چلتی ٹرین کی کھڑکیوں سے نظر آنے والے حسین اور دلکش مناظر محض نظر کا دھوکہ تھے:

''وہ مناظر جو ٹرین پر سے دکھلائی دیتے تھے، یہاں بالکل نزدیک سے دیکھنے کو ملے، ان میں نہ حسن تھا، نہ دلکشی اور گاڑی جب کسی گاؤں کے بیچ سے گزرتی تو مکانوں کی خستہ حالی پہلے اندازے کی تردید کرتی نظر آتی، نزدیک سے دیکھنے پر چہروں پر آسودگی کم دکھلائی دیتی۔ کھیتوں کی دھوپ میں جلے ہوئے چہروں پر جابہ جا فکر، پریشانی اور افلاس کی تحریریں رقم تھیں۔''

سفرنامہ نگار، پڑھنے والے کو جگہ اور ماحول کے متعلق نئی اور اہم معلومات فراہم کرتا ہے، وہ اس کے وسیلے سے قاری کو اپنے تجربات اور مشاہدات میں شریک کرلیتا ہے، ایک مشاق ادیب ان واقعات اور مشاہدات کو نئی ترتیب و تنظیم کے ساتھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری بڑی حد تک اس کی خوشی وغم، خوف یا بے چینی میں اپنے آپ کو شریک پاتا ہے۔

زنگی پور اور کانٹا کھالی گاؤں کی بابت الیاس احمد گدی نے جو تجربات اور مشاہدات پیش کئے ہیں وہ بے حد خوف ناک ہیں، اس گاؤں میں گزرے تین دن قیدی اور مجرم کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ ایک ویران سی کوٹھری، بند کھڑکیاں اور دروازہ، اس پر مستزاد یہ کہ ہر لمحہ پکڑے جانے کا خوف، حتیٰ کہ جسم سے ہندوستانی کپڑے اور لیبل نوچ دیے گئے۔ بس شرٹ اور شوخ رنگ کی لنگی پہنائی گئی، اردو کی جگہ بنگلہ زبان بولنے یا خاموش رہنے کی ہدایت۔ تیسری شب کے بارہ بجے دو ملکوں کی اس سرحد کو عبور کیا، جہاں محض دو ڈھائی برس پہلے انتہائی خون ریز جنگ ہو چکی تھی، لاکھوں جانیں گئی تھیں اور کروڑوں برباد ہوئے تھے، اس وقت بھی سرحد کے دونوں طرف فوجیں اور چوکیاں موجود تھیں۔ موت، اذیت ناک اور ناگہانی حادثے کے خطروں کے درمیان پدماندی کشتی سے پار ہونے میں کامیاب تو ہوگئے۔ لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ ایک حساس فنکار ایسے حالات کی تصویر کشی کس طرح کرتا ہے ملاحظہ فرمایئے:

''ہم لوگ گڑھے میں اکڑوں بیٹھ گئے تھے۔ جیسے رفع حاجت کے لیے بیٹھتے ہیں ہمارے دلوں کی دھڑکن کافی تیز ہوگئی تھی، رات کے تقریباً دو بج رہے تھے۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ لامحدود اندھیرے میں ایک گڑھے میں دم سادھ کر بیٹھے ہم چار آدمی، اپنی بے بسی اب کھل رہی تھی اور خوف سے ہمارے جبڑے بھنچ گئے تھے۔'' ص-33

خیر و شر کی شناخت اور نظام مصطفےٰ کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی خواہش کے ساتھ پاکستان وجود میں آیا تھا، سیکڑوں میل لمبی لکشمن ریکھا کھینچ دی گئی، لیکن کوئی تبدیلی واقع نہ ہوسکی، بلکہ حالات زیادہ خراب تھے۔ مشرقی پاکستان کے مضافاتی علاقوں میں بھوک، غربت اور افلاس کی کثرت، ہر علاقے میں غنڈوں کا راج، ان کے دھندے بھی خطروں سے کھیلنے والے تھے۔ سرحد پار کرانے، منشیات کی اسمگلنگ، تاجروں سے خراج وصولنے، قتل و غارت، سپاری، ان کے خوف سے سارا علاقہ تھر تھر کانپتا تھا۔ محض ایک شخص محمد اسلام کی شبیہ الیاس احمد گدی کے لفظوں میں ملاحظہ کیجئے:

''جب ذرا مطلع صاف ہوگیا تو میں نے اسلام کو غور سے دیکھا، وہ اکہرے بدن اور اوسط قد کا ایک معمولی آدمی تھا، مگر اس کی آنکھیں حیرت انگیز حد تک ڈراؤنی تھیں۔ آنکھوں کے دونوں گوشے دونوں طرف کھنچے ہوئے تھے، ایسی آنکھیں پرانے زمانے میں منگولوں کی ہوا کرتی تھیں۔ سفاک اور بربر......ایسا لگتا تھا جیسے وہ خالص بنگالی نہ ہو، اس میں کچھ چینی یا تبتی آمیزش ہو۔'' ص-38

واضح رہے کہ الیاس احمد گدی نے جغرافیائی یا تاریخی حالات پر روشنی ضمناً ڈالی ہے۔ لیکن اسے عیب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے کہ سفرنامہ نگار کی توجہ ان حالات کے بیان پر مرکوز رہتی ہے، جن کا مشاہدہ وہ بذات خود کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر جغرافیائی اور تاریخی حالات کی تفصیلات موجودہ سفرناموں میں مخفی ہوگئی ہیں۔ جب کہ تجربات ومحسوسات کی عکاسی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے تجربات ومحسوسات میں جتنی بوقلمونی اور گہرائی ہوگی سفرنامہ اتنا ہی دلچسپ اور معلوماتی ہوگا۔ ورنہ محض روزنامچہ بن کر رہ جائے گا۔ ایک کامیاب سفرنامہ نگار محض متعلقہ علاقے کی زندگی، معاشرتی وتمدنی حالات پر روشنی ڈالنے کے بجائے مختلف علاقوں کے درمیان تقابل اور موازنہ کر کے معاشرتی وعلاقائی امتیاز کے علاوہ کوتاہیوں اور کمیوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

''اب دن نکل آیا تھا اور لوگ باگ اپنے کام کاج میں لگ گئے تھے، میں نے پہلی بار مشرقی پاکستان کے لوگوں کو دیکھا زیادہ تر کسان تھے ناٹا قد مگر بے حد تندرست، خاص طور سے بازو بے حد گٹھے ہوئے، شانے چوڑے اور بے حد پھرتیلے، ہمارے یہاں کے بنگال سے یہ آبادی بالکل مختلف تھی۔ ہمارے یہاں کے بنگالی دبلے پتلے مگر بے حد ذہین اور مہذب دکھلائی دیتے ہیں جب کہ یہ لوگ ہٹے کٹے اور محنتی تھے۔ تمام لوگوں کا لباس بنیان اور لنگی تھا......سوتی کپڑوں کی یہاں سخت کمی تھی، دوسری اہم بات کہ یہاں کا غریب سے غریب آدمی بھی سگریٹ پیتا ہے، بیڑی نہیں ملتی۔'' ص-41

سفرنامہ آپ بیتی کی ایک شکل ہے اس لیے افسانوی رنگ پیدا ہونا قابلِ

قیاس ہے۔لیکن یہ افسانے سے ان معنوں میں مختلف ہے کہ جہاں افسانہ نگار حقائق کو فرضی واقعات اور کرداروں کی مدد سے پیش کرتا ہے سفرنامہ نگار حقائق کو ان کے اصل رنگ روپ کے ساتھ ہمارے سامنے رکھتا ہے۔تاہم حقیقت کے نقوش کو تخیل کی آمیزش سے کچھ ایسا رنگ عطا کرتا ہے کہ یہ زیادہ دل فریب اور پرکشش بن جاتے ہیں۔

سفرنامے کا اسلوب بیانیہ ہوتا ہے جس کے ذریعے واقعات و مناظر کے نقش جزئیات کے ساتھ نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔سفرنامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مشاہدہ باریک بیں اور تخیل بیدار ہو۔اس کا قلم مصور کا قلم ہو اسے زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہو جب تک وہ ان سارے اوصاف کا حامل نہ ہو، وہ سفرنامے کو خارجی حقائق کے سپاٹ بیان سے ممیز کر کے اسے ادب پارے کی شکل نہیں دے سکتا جس میں تخیل کی کرشمہ کاری، داخلی نگاہ کی روشنی اور انداز بیان کے حسن کے علاوہ ادراک اور حقیقت کے نئے زاویے اور پہلو بھی شامل ہوں۔الیاس احمد گدی کا یہ بیانیہ انداز ملاحظہ ہو:

''سفید اور ہرے رنگ کی پاکستانی ٹرین بہت سست رفتار تھی۔سب سے بڑی مصیبت جو اس ٹرین میں تھی وہ بھکاری تھے۔یہ گا گا کر، گھگھیا گھگھیا کر یا کلام پاک کی آئتیں پڑھ پڑھ کر بھیک مانگتے تھے۔میرے سامنے ایک شخص آ کر تحریمہ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔میں نے گھبرا کر سوچا کہ شاید نماز پڑھنا چاہتا ہے۔جلدی سے چپل سیٹ کے نیچے کھسکا کر پاؤں اوپر سیمٹ لیا، پھر خیال آیا کہ ابھی کون سی نماز کا وقت ہے؟ وہ آنکھیں بند کیے استغراق میں آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا دھیرے دھیرے اس کی آواز تیز ہوتی گئی پتہ چلا کہ وہ کلام پاک کی آیت پڑھ رہے ہیں۔ذرا دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں پھر اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔بھائیو! خدا کے نام پر، رسولؐ کے نام پر، جس کی آیتیں آپ نے سنیں۔'' ص-50

قدیم تاریخی شواہد کی رو سے شہر ڈھاکہ کو پال بادشاہوں نے بسایا تھا، یہاں کے کاریگروں نے پارچہ بانی کی صنعت کو فن کا درجہ عطا کیا تھا، یہاں کی ململ پوری دنیا میں مشہور تھی، لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے علاقائی صنعت کو تہس نہس کر دیا۔پاکستان بننے کے بعد اس شہر کی دوبارہ آباد کاری ہوئی، سڑکیں کشادہ بنیں، مغل، امریکی اور چینی طرز تعمیر کی آمیزش سے عمارتیں بنوائی گئیں۔محمد پور، نیو مارکیٹ، سکنڈ کیپٹل، بیت المکرم وغیرہ محلے وجود میں آئے۔الیاس احمد گدی نے ڈھاکہ کی سب سے خوبصورت بیت المکرم مارکیٹ کی وجہ تسمیہ اس طرح پیش کی ہے۔

''بیت المکرم دراصل مسجد کا نام ہے یہ مسجد نہایت پرشکوہ اور خوبصورت ہے۔دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کی طرح اس میں بھی چاروں طرف سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔اذان ہوتی ہے تو چاروں طرف سے سیکڑوں آدمی سیڑھیاں چڑھتے نظر آتے ہیں اسی مسجد کی کفالت کے لیے یہ مارکیٹ بنا تھا اور اسی مسجد کے نام پر اس کا نام بیت المکرم رکھا گیا۔'' ص-68

موتی جھیل علاقے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ علاقہ ڈھاکہ کا بہت ارسٹوکریٹ علاقہ ہے سرسبز شاداب خوش قد سرو کے درخت قطار اندر قطار کھڑے ملے اور پھر یوکلپٹس کے بے حد لانبے درخت اور پھر آم کے چھوٹے اور گھنے پیڑ ان پیڑوں کے بیچوں بیچ میں بنی ہوئی عمارتیں، جو زیادہ تر بڑی بڑی یونٹوں کے کاروباری دفاتر تھے۔سڑکیں نہایت صاف ستھری اور خاموش، چہار سو ایک عجب طرح کا سکون چھایا ہوا۔''

الیاس احمد گدی نے وہاں کی کئی مذہبی اور ادبی شخصیتوں سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔اردو کے نامور اور بالغ نظر نقاد نظیر صدیقی سے متعلق قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔مولانا ارشد القادری، منظر شہزاد وغیرہ کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ بنگلہ، انگریزی اور اردو زبان کی صورتحال، اردو رسائل و جرائد کے تذکرے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس علاقے میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے امکانات خوشگوار نہیں، اس کی بڑی وجہ خوشحال طبقے کی بے اعتنائی عوام اور حکومت کی عدم دلچسپی بتائی ہے۔

سفرنامہ ایک اعتبار سے آپ بیتی ہی کی شکل ہے، یہ ایک طرح سے سفرنامہ نگار کے داخلی وجود کا اظہار بھی ہے جس کے ذریعے اس کی اندرونی کیفیات کے نوبہ نو مرقعے سامنے آتے ہیں لیکن سفرنامے میں سفرنامہ لکھنے والا اپنی شخصیت کو بہرحال پوشیدہ رکھتا اور ''میں'' کے استعمال میں محتاط رہتا ہے۔اپنی شخصیت کی ثناخوانی، خودنمائی یا اس میں خواہ مخواہ رنگ بھرنا درست نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ 'میں' کی لے جتنی دھیمی اور پوشیدہ ہوگی سفرنامہ اتنا ہی بہتر ہوگا۔الیاس احمد گدی نے جہاں جہاں ادبی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے، وہاں اپنی اور خاندان کی صلاحیتوں و ادبی مرتبے کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے مثلاً نظیر صدیقی نے مولانا ارشد القادری سے تعارف اس طرح کرایا ہے۔

''یہ اردو کے ایک نامور افسانہ نگار الیاس احمد گدی ہیں، انڈیا سے آئے ہیں۔الیاس اور ان کے بھائی غیاث احمد گدی ان دونوں بھائیوں کے احسان سے اردو کے افسانوی ادب کی گردن جھکی ہوئی ہے۔'' ص-72

شہزاد منظر کے تاثرات دیکھیے:

''میں کہتا ہوں یار کہ تم رہ جاؤ اور غیاث کو بھی بلوا لو۔یہ سالے مغرب والے بڑا اکڑتے ہیں۔اگر دونوں بھائی آ جائیں تو یہاں افسانہ نگاروں کی جو کمی ہے نا۔'' ص-84

''نظیر صدیقی نے میرا تعارف زوردار الفاظ میں کرایا تھا اس کا ایک خاص اثر یہ مرتب ہوا کہ دوسرے دن سے کئی لوگ روز ملنے آنے لگے۔وجہ یہ تھی کہ نظیر صاحب نے کبھی کسی کی بے جا تعریف میں نہ ایک جملہ لکھا نہ ایک

جملہ اپنی زبان سے ادا کیا۔ انھوں نے کسی کی تعریف میں ایک جملہ کہہ دیا تو وہ سند کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اور پھر میری سند تو کافی زوردار تھی۔'' ص-101

سفرنامہ نگار تنقیدی و تعمیری فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ وہ جن خطوں اور علاقوں کی سیر کرتا ہے ان کی تعریف و توصیف بھی بیان کرتا ہے۔ اور ان کوتاہیوں اور کمیوں کو بھی گرفت میں لاتا ہے جو متعلقہ علاقے کے تہذیب و تمدن اور سیاسی نظام میں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک باریک بیں سفرنامہ نگار ان اسباب کی نشاندہی بھی کرتا ہے جو معاشرتی و تمدنی سطح پر خلیج کو جنم دیتے ہیں۔ سفرنامے اپنی انھی خصوصیات سے نہ صرف تمدنی و تہذیبی، سیاسی و سماجی تاریخ بناتے ہیں بلکہ ہمارے علمی و عقلی شعور میں اضافے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں روز اول سے ہی بنگالی، غیر بنگالی یا بہاری کی تفریق نے ایک خلیج پیدا کر دی تھی۔ زبانیں بسا اوقات مذہب اور عقیدے کو بھی پیچھے چھوڑ دیتی ہیں۔ ڈھاکہ میں پچیس فٹ اونچا شہید مینار، اس کی زندہ مثال ہے۔ ایوب خاں کے زمانے میں بنگالیوں پر اردو زبردستی تھوپنے کی کوشش کے خلاف جو احتجاج ہوا جس کے نتیجے میں چار طالب علم پولیس کی گولی کے شکار ہوئے۔ شہید مینار اس کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے۔ مغربی پاکستان کے ارباب اقتدار بھول گئے کہ زبانیں محض ایک ذریعۂ اظہار نہیں ہوتیں۔ اس ضمن میں ایک بنگالی کا تاثر دیکھیے:

''ہر زبان کی اپنی تہذیب ہوتی ہے جس کی جڑیں دور تک پھیلی ہوتی ہیں اور زبان قوم کی شناخت بھی ہوتی ہے اور اگر وہ اس سے چھین لی جاتی ہے تو اس کے پاس کیا بچتا ہے؟ ہم سے سب کچھ چھن چکا ہے مگر ہم اپنی شناخت کیسے چھننے دیتے۔ ہم بنگالی اس معاملے میں بہت زود حس ہیں۔ ہم کو مذہب کی دہائی دی جاتی ہے۔ آپ تو پڑھے لکھے ہیں آپ بتائیے کیا ٹیگور کے گیت گانے سے آدمی مسلمان نہیں رہتا۔ کافر ہو جاتا ہے؟'' ص-90

دراصل پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی مغرب والوں نے اپنے آپ کو آقا سمجھ لیا تھا۔ اپنے احکام تھوپنے اور ان کے حقوق کی پامالی نے بنگالیوں کے اندر ردِعمل پیدا کیا۔ خود کو ٹھگے جانے کے احساس نے ایک ایسی ذہنیت کو پروان چڑھایا جس میں نفرت اور احتجاج کی آمیزش تھی۔ جس کی نشاندہی الیاس احمد گدی نے کی ہے۔ تقسیم کے بعد ہندوستان سے جوق در جوق مہاجر مشرقی پاکستان میں جب داخل ہوئے تو بنگالیوں نے اپنی اسلامی تعلیمات کی پیروی کرتے ہوئے اپنے مہاجر بھائیوں کا خیر مقدم کیا گویا انھوں نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی تاریخ دہرانے کی کامیاب کوشش کی۔ انھوں نے اپنی زمینیں دیں، اپنی لڑکیوں سے بیاہ کیا، ان کی آبادکاری میں کوئی کسر نہ چھوڑی، لیکن یہی مہاجر اور مسلمان بھائی ان کی زمین ہڑپنے لگے، پھر زمیندار بننا شروع ہوئے اور شہروں میں ان کی لیاقت سے تین گنی اونچی نوکریاں، سرکاری ٹھیکوں، کاروبار اور عیش و عشرت پر ان کا قبضہ ہو گیا تو اقتدار کا نشہ ان پر ایسا چڑھا کہ غریب بنگالی انھیں کم تر درجے کے انسان نظر آنے لگے۔

پرانا ڈھاکہ تنگ گلیاں، چھوٹی چھوٹی جھگیاں، مچھلی کی بساندھ، بدن کی گرمی، پسینہ اور حبس، میلی بنیان اور چار خانے والی سستی لنگیاں ان کا مقدر ٹھہرا۔ غریب بنگالیوں کا یہ علاقہ غریب ہوتا گیا۔ رکشہ چلانا، بوجھ ڈھونا، مچھلی پکڑنا اور دلالی ان کا پیشہ بن گئے، اس کے آگے رنڈیوں کے ڈیرے۔ گویا انگریزوں نے 'برتھ ڈے' کیک کی طرح مشرق کا ایک حصہ کاٹا اور مغرب کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جب کہ نیا ڈھاکہ، سعید پور، دھان منڈی وغیرہ جہاں نوکر شاہی کا کروفر، شان و شوکت، ہر عمارت نئی، ہر سڑک نئی، باغیچہ، سرکاری رعب داب، بڑے بڑے عہدیداروں اور منسٹروں کے چپراسیوں تک کے چہرے سے جلال ٹپکتا ہوا۔ یہ سماج کے درمیان خلیج فیوڈل پروڈکٹ کی دین تھی۔ ایک غیر بنگالی کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں:

''بات دراصل یہ ہے الیاس بھائی کہ یہ بنگالی جو ہیں نا یہ کوفی ہیں۔ کوفی سمجھتے ہیں نہ آپ؟ یعنی کوفہ کے رہنے والے جنھوں نے حضرت حسین کو خط لکھ کر بیعت کے لئے بلوایا اور خود پلٹ گئے۔ ان کا بھی کچھ ٹھیک نہیں، کب اور کہاں دھوکہ دیں کہا نہیں جاسکتا۔'' ص-98

الیاس احمد گدی نے سفرنامے کے آخری حصے میں بعض اداروں، شہروں اور قصبوں کے ذکر کے بعد اپنی واپسی اور درپیش پریشانیوں پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ خوف بے چینی اور بے یقینی کے عالم میں مرشد آباد کی بہ جائے سید پور کے بنیا پل کے راستے رات کی تاریکی میں واپس ہوئے۔

اس سفرنامے میں سماجی، تاریخی اور سیاسی مسئلوں پر بہ طور خاص توجہ دی گئی ہے، باوجود اس کے ان کا بیان صحافتی شکل اختیار نہیں کرتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ فن ان لوگوں کے یہاں صحافت بنتا ہے جو گہرا تخلیقی اور جمالیاتی شعور نہیں رکھتے۔ ایک بڑا فن کار ''فن اور حقیقت'' کو اس طور پر یکجا کر کے پیش کرتا ہے کہ دونوں ایک وحدت میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور پھر یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ حقیقت کا عمل کہاں سے شروع ہوا اور فن کا عمل کہاں پر ختم۔ جب فن اور حقیقت ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں تب ہی جمالیاتی وحدت قائم ہوتی ہے۔ الیاس احمد گدی کا سفرنامہ بعض کوتاہیوں کے باوجود سابق مشرقی پاکستان کو دیکھنے اور سمجھنے کا ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے ہم وہاں کے حالات اور زندگی کے روبہ رو ہوتے ہیں۔

□□□

پتہ:
Department of Urdu, BHU, Varanasi

اسد رضا

صحافتی ترجمے کے مسائل

ترجمہ ایک فن ہے اور اس کی جڑیں عہدِ قدیم میں پیوست ہیں۔ یونان، ہندوستان، ایران اور چین جیسے متعدد ممالک میں یہ فن عیسوی سن سے قبل ہی وجود میں آچکا تھا لیکن چھاپہ خانے کی ایجاد اور اخبارات و رسائل اور کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد فن تدوین و ترجمہ سے ہزار ہا افراد وابستہ ہوگئے۔ متعدد اداروں میں اس کی با قاعدہ تربیت دی جانے لگی۔ 1822 میں اردو اخبار ''جام جہاں نما'' کی اشاعت کلکتہ سے شروع ہوئی تو اس زبان میں بھی ترجمے کے ماہرین کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ 19ویں صدی میں اردو صحافت کا سب سے بڑا مسئلہ ترجمے کے ماہرین کی کمی کا تھا لیکن بیسویں صدی تک آتے آتے اردو زبان میں اس فن کے ماہرین خاصی تعداد میں ملنے لگے، کچھ ایسے ادارے بھی قائم ہوئے جن میں ترجمے کی تربیت دی جاتی تھی۔ اب ہندوستان اور پاکستان میں اردو مترجمین کی تعلیم و تربیت کے متعدد ادارے موجود ہیں تاہم ان اداروں میں نظریاتی یعنی تھیوریٹیکل تعلیم تو دی جاتی ہے مگر عملی تربیت کی آج بھی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ اس لیے ان اداروں سے فارغ طلبہ جب عملی صحافت میں آتے ہیں تو ترجمہ کرتے ہوئے اکثر ٹھوکر کھا جاتے ہیں اور افسوس ناک مگر دلچسپ غلطیاں کرتے ہیں۔ چونکہ میں گزشتہ تین دہائیوں سے اردو صحافت سے منسلک ہوں لہٰذا ترجمے کے سلسلے میں درپیش مسائل پر روشنی ڈالنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فن ترجمہ کی صحافت میں انتہائی اہمیت ہے۔ اردو اخبارات میں انگریزی اور دیگر زبانوں سے عموماً تراجم کیے جاتے ہیں۔ یو این آئی کی اردو سروس اور اردو فیچر سروس شروع ہونے سے قبل تو اردو اخبارات میں مترجمین کی اشد ضرورت ہوتی تھی کیونکہ تقریباً 80 فیصد خبروں اور مضامین کا دیگر زبانوں سے ترجمہ ہی کیا جاتا تھا۔ اردو زبان میں فیچر اور نیوز سروس کے آجانے کے بعد ترجمہ شدہ مضامین اور خبریں اردو اخبارات کو مناسب تعداد میں ملنے لگی ہیں۔ لہٰذا مترجمین پر اردو اخبارات بالخصوص روزناموں کا انحصار کم تو ہوا ہے لیکن ختم نہیں ہوا۔ دراصل ماہر مترجمین کی ضرورت تو ہر دور میں رہی ہے اور ترجمہ کرنے والے کمپیوٹروں کی آمد کے باوجود مستقبل میں بھی رہے گی۔

صحافت بالخصوص روزناموں میں خبروں اور مضامین کا ترجمہ نہایت عجلت میں کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایک روزنامے میں ماہر اور تیز رفتار سے ترجمہ کرنے والے ہی یہ ذمے داری نبھا سکتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایک مضمون یا بڑی خبر کا ترجمہ آدھے گھنٹے میں ہی کرکے کمپوزنگ کے لیے دینا ہوتا ہے تاکہ جلد سے جلد مضمون یا خبر اخبار کے مناسب صفحے پر لگ جائے اور پرنٹنگ کے لیے صفحہ معینہ وقت پر چلا جائے۔ اسی لیے ایک مفکر نے کہا ہے Journalism is Literature in Hurried یعنی صحافت عجلت میں لکھا ہوا ادب ہے۔ اس عجلت کی وجہ سے عموماً روزناموں اور نیوز ایجنسیوں میں لفظی ترجمے پر کم اور آزاد ترجمے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ بعض صحافی لفظی ترجمے اور آزاد ترجمے کے درمیان توازن کو ترجیح دیتے ہیں تاہم مکھی پر مکھی بیٹھانے والے مترجم کو صحافت میں پسند نہیں کیا جاتا۔ بقول ظ. انصاری جو خود ایک اچھے مترجم اور صحافی تھے، ''ترجمہ کرنے والا اپنے وجود، خیال، جذبے اور اپنے قلم کو اصل مصنف کے سپرد کردے اور یہ سوچ لے کہ اگر فلاں بات، فلاں جملہ، تصنیف، عبارت یا محاورہ مصنف کو خود ہماری اسی زبان میں لکھنا ہوتا تو وہ کس طرح لکھتا۔'' لیکن ترجمے کے سلسلے میں انگریز مصنف تھیوڈ ساوری نے لفظ بہ لفظ ترجمے کی حمایت کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''لفظی ترجمے کو ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس سے مصنف کے اسلوب کے نزدیک تر آنے کا زیادہ امکان ہے۔''

جہاں تک صحافت میں ترجمے کا سوال ہے تو کہیں لفظ بہ لفظ ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے اور کہیں آزاد ترجمے کی۔ مثال کے طور پر اگر صدر جمہوریہ یا وزیراعظم کا کوئی اہم اور پالیسی ساز بیان ہے تو اس کا ترجمہ لفظ بہ لفظ ہی کیا جاتا ہے لیکن عام خبروں، رپورٹوں اور مضامین کا آزاد ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ اردو اخبارات میں ترجمہ کرنے والوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحات کے ترجمے کا ہے۔ اگرچہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور دیگر چند اداروں نے اصطلاحات بالخصوص سائنسی و سیاسی اصطلاحات سے متعلق کتب شائع کی ہیں لیکن اصطلاح سازی میں مرکزیت کے فقدان کے باعث ہر ایک نے اپنی اپنی اصطلاحات الگ الگ بنائی ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی کا ایک لفظ ہے Pluralisim جس کا ترجمہ کسی نے تکثیریت کیا، کسی نے کثرت الوجود تو کسی نے کثرت پسندی۔ اس صورت حال سے عموماً صحافیوں میں یہ تذبذب پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ کسی لفظ کا ترجمہ کیا کریں۔ بات یہیں تک محدود نہیں، مختلف علاقوں اور ریاستوں میں بھی الفاظ کے تراجم مختلف ہیں۔ مثلاً جنوبی ریاستوں آندھرا پردیش، کرناٹک، تمل ناڈو وغیرہ میں اگر اخبارات ''بجلی

کی سربراہی'' لکھتے ہیں تو شمالی ریاستوں دہلی، یوپی اور بہار وغیرہ میں ''بجلی کی سپلائی'' لکھا جاتا ہے۔ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ ایک ہی اخبار میں سینئر صحافی اپنی اپنی اصطلاحات چلاتے ہیں اور قاری پریشان ہوجاتا ہے۔ جونیئر صحافی کو تو اس سلسلے میں بزرگ صحافیوں سے ڈانٹ بھی کھانا پڑتی ہے۔ ایک جونیئر صحافی نے جب Founding Conference کا ترجمہ تاسیسی کانفرنس کردیا تو چیف سب ایڈیٹر نے سختی سے کہا صحیح ترجمہ ''تشکیلی کانفرنس ہے'' جونیئر سب ایڈیٹر نے ''تاسیسی'' کی جگہ ''تشکیلی کردیا۔ لیکن جب اس ترجمے کو مدیر اعلیٰ نے دیکھا تو وہ جونیئر صحافی پر خفا ہوگئے۔'' آپ کو ترجمہ کرنا نہیں آتا۔ Fonding کا صحیح ترجمہ تاسیسی ہے تشکیلی نہیں۔'' یہ صورت حال اکثر اخبارات کے دفاتر میں نظر آتی ہے، لیکن بعض اخبارات اس مسئلے کے حل کے لیے اپنی اپنی اسٹائل بک تیار کرلیتے ہیں اور پھر اس کے مطابق ہر صحافی الفاظ لکھتا او راصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ اگر یہی کام قومی پیمانے پر کیا جائے تو اصطلاحات سازی اور ترجمے میں دشواریاں کم ہوجائیں۔ اس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں تاہم ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔

اردو کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر اکثر یہ شکوہ کرتے ہیں کہ اردو روزنامے زبان کو بگاڑ رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ شکوہ بجا ہے لیکن آج میڈیا کی وجہ سے نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانیں بھی تبدیل ہورہی ہیں اور اس عمل کو روکا بھی نہیں جاسکتا تاہم اسے ایک مثبت سمت ضرور دی جاسکتی ہے۔ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا زبان کو آسان بنانا اور عام آدمی تک ترسیل ہر ایک کا مقصد ہے۔ اخبارات یا ٹیلی ویژن چینلوں میں ادبی و مذہبی مضامین یا پروگراموں کی زبان معیاری ہوتی ہے تاہم عام خبروں کی زبان کو آسان رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ثقیل الفاظ سے دانستہ طور پر گریز کیا جاتا ہے۔ یوں بھی اخبارات کے قارئین میں دانشوروں کی تعداد کم اور کم پڑھے لکھے افراد کی تعداد زیادہ ہوتی ہے لہٰذا دانشورانہ زبان کا استعمال اخبارات میں کم سے کم کیا جاتا ہے۔ انگریزی اور ہندی کو چونکہ ہندوستان میں سرکاری طور پر نہایت اہم سمجھا جاتا ہے لہٰذا اردو صحافت کو بھی سب سے زیادہ دونوں زبانوں کے الفاظ نے ہی متاثر کیا ہے۔ ادھیکاری، نگم، گرام پنچایت، پردھان، سواگت جیسے ہندی الفاظ اردو اخبارات میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ کچھ غلط اصطلاحات بھی ہندی کے نام پر اردو اخبارات میں نظر آنے لگی ہیں۔ مثلاً ''اس کے چلتے'' یہ معنی'' اس وجہ سے''' خلاصہ کرنا'' کے معنی ہیں اختصار کرنا لیکن ہندی میڈیا اس اصطلاح کو وضاحت یعنی کسی بات کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے نتیجتاً بعض اردو اخبارات بھی ''خلاصہ'' کا استعمال تفصیل ہی کے معنی میں کرنے لگے ہیں۔ اسی طرح جذبے کی جمع جذبات اور خیال کی جمع خیالات ہے لیکن ہندی اخبارات نے جذباتوں، خیالاتوں اور کاغذاتوں وغیرہ کا استعمال کیا تو اردو کے جونیئر صحافی بھی اس بدعت کا شکار ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی غلطیوں کی اصلاح نئے صحافیوں کے لیے ورکشاپ اور ریفریشر کورس کا انعقاد کرکے کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس قسم کی ورکشاپ اور ریفریشر کورس میں ماہرین لسانیات اور ادب و صحافت کے پروفیسروں کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں سینئر صحافیوں کو بھی مدعو کیا جانا چاہیے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو پروفیسر آل احمد سرور کے مطابق زبان کی تین قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ ایک کاروباری زبان، دوسری ادبی زبان اور تیسری علمی زبان۔ جہاں تک صحافت کا تعلق ہے تو اس میں تینوں قسم کی زبان کا استعمال موقع و محل کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر عام خبر اور رپورٹ کی زبان کاروباری ہوتی ہے۔ گوشۂ ادب کی زبان جس میں شاعری افسانے، طنز و مزاح اور تنقیدی مضامین ہوتے ہیں، ادبی ہوتی ہے لیکن مذہب و فلسفہ معاشیات و سماجیات سے متعلق مضامین یا ادارتی صفحے پر شائع ہونے والے مضامین کی زبان علمی ہوتی ہے اور نسبتاً مشکل بھی۔ خبر اور رپورٹ کا ترجمہ عموماً سب ایڈیٹر کرتا ہے، جبکہ ادبی گوشے کی زبان اور ترجمہ کو درست کرنے کے لیے ایک تجربہ کار صحافی ہوتا ہے جس کا کسی نہ کسی طرح شعر و ادب سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ علمی مضامین کے ترجمے یا تدوین کی ذمے داری عام طور پر ایک ایسے سینئر صحافی کو سونپی جاتی ہے جو اردو کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی عبور رکھتا ہے۔ معیاری اردو اخبارات میں مترجم یا سب ایڈیٹر کی تیار کردہ خبر یا رپورٹ کو سینئر سب ایڈیٹر بہ نظر غائر دیکھتا ہے۔ بعد ازاں چیف سب ایڈیٹر اہم خبروں کے ترجمے اور زبان کی چیکنگ کرتا ہے۔ روزنامے کا صفحہ تیار ہونے کے بعد نیوز ایڈیٹر، بیورو چیف یا ایڈیٹر عموماً سرخیوں اور تاریخوں وغیرہ کو سرسری نظر سے دیکھ کر صفحے کو چھپنے کے لیے بھیجتا ہے۔ تاہم اتنی احتیاط کے باوجود خبروں میں ترجمے اور زبان و بیان کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ پروف کی غلطیاں ڈی ٹی پی آپریٹر یا کاتب درست نہیں کرتا۔ چونکہ تربیت یافتہ مترجم یا اردو زبان پر عبور رکھنے والے صحافی کمیاب ہیں لہٰذا اخبارات کا معیار بلند کرنے میں سینئر صحافیوں کو خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اردو کے اخبارات چونکہ ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں مثلاً دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، پٹنہ، ممبئی، بنگلور، کولکاتہ، کانپور، جالندھر، بھوپال، جموں، سری نگر، نظام آباد، رانچی، چنئی، الہ آباد، مراد آباد، میرٹھ، بریلی، رامپور، گورکھپور وغیرہ سے شائع ہورہے ہیں لہٰذا ان شہروں میں ریاستی و مرکزی حکومتوں، اردو اکادمیوں، اقلیتی فلاح و بہبود سے متعلق اداروں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی نیز دیگر تعلیمی و علمی اداروں کو اردو صحافیوں کی

تربیت کے لیے خصوصی ورکشاپ اور ریفریشر کورسیز کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اگر چہ مذکورہ بالا اداروں میں سے کچھ اس قسم کا اہتمام کرتے بھی رہتے ہیں لیکن یہ کام بڑے پیمانے پر ہونا چاہیے۔ ہمیں اس حقیقت کو ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ کسی بھی زبان کو بنانے اور بگاڑنے میں اساتذہ کے ساتھ ساتھ اخبارات اور صحافی بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔

اردو صحافت میں اگر چہ کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا استعمال خوب ہورہا ہے تاہم اردو کمپوزنگ میں کم از کم ہندوستان میں ایک کمی ضرور ہے اور وہ یہ کہ انگریزی اور ہندی میں کمپیوٹر ہی املا او رہجوں کو درست کرتا ہے۔ مثلاً اگر انگریزی میں آپ Minister لفظ کی Spelling کمپوز کرتے وقت Menister لکھیں گے تو کمپیوٹر آپ کو آگاہ کردے گا کہ Spelling غلط ہیں اور بعد میں وہ صحیح Spelling کمپوز بھی کردے گا۔ مگر ابھی تک یہ سہولت ہندوستان کے اردو کمپیوٹر میں دستیاب نہیں ہے۔ ملک کے شمال، جنوب اور مغرب و مشرق میں اردو اخبارات کو نئی زندگی اور زبان کو معیار عطا کرنے کے لیے لفظ کا املا اور ہجے درست کرنے والا کمپیوٹر نہایت ضروری ہے۔ اردو صحافت کی زبان اور اس کے ترجمے کے مسائل پر بھی خصوصی توجہ دینے اور انھیں منصوبہ بند طریقے سے حل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ □□□

پتہ:
E-11/47, Hauz Rani,
Malvia Nagar, New Delhi-110017

وضاحتی کتابیات (22 جلدوں میں)

مرتب: مظفر حنفی

پروفیسر مظفر حنفی نے قومی اردو کونسل کے ایک منصوبے کے تحت سال بہ سال شائع ہونے والی کتابوں کے تعارف اور مختصر تبصرے پر مبنی ''وضاحتی کتابیات'' کل 22 جلدوں میں مرتب کی ہے۔ ہر برس کی کتابوں کا ذکر الگ الگ جلدوں میں ہے۔ موصوف نے وضاحتی کتابیات کے متعینہ اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں متعلقہ کتاب کے بارے میں معروضیت کے ساتھ ضروری اطلاعات فراہم کردی ہیں، جن کے وسیلے سے محقق اور طالب علم مطلوبہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

22 جلدوں کی مجموعی قیمت:-/2693 روپے

دیوان درد

مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد

خواجہ میر درد اردو کے صرف صوفی شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی غزلیہ شاعری غزل کی اس توانا روایت کا حصہ ہے جس کی نمائندگی اعلیٰ سطح پر میر تقی میر کر رہے تھے لیکن افسوس کہ درد کی وفات کے بہت بعد ان کے کلام کی اشاعت ہو پائی اور وہ بھی اختلافات متن کے ساتھ۔ ہندو پاک میں ''انتخاب کلام درد'' اور ''دیوان درد'' کے انھی متعدد مطبوعہ وغیر مطبوعہ نسخوں کے پیش نظر ڈاکٹر نسیم احمد نے ''دیوان درد'' کا یہ نسخہ ترتیب دیا ہے اور اس کی تفصیلی وضاحت مقدمے میں کردی ہے۔

صفحات: 336، قیمت:-/160 روپے

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

یہ کتاب ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیمیناروں میں پڑھے تھے۔ ان مقالوں میں انھوں نے تعلیمی عمل کو تدریسی اور تنظیمی دونوں نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ دور میں تعلیمی، مادی، سماجی اور اخلاقی ترقی سے متعلق جتنی نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں اسی قدر ہم میں ناآسودگی اور بے چینی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ایسے میں محاسبے، تجزیے اور عمل میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے یہ کتاب ہماری ذہنی تربیت کرتی ہے۔

صفحات: 307، قیمت-/96 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

آلوک دیشوال

ہند کا محکمۂ آثار قدیمہ

ہند کا محکمہ آثار قدیمہ (اے ایس آئی) 1961 میں قائم کیا گیا تھا اور یہ محکمہ ثقافت سے منسلک دفتر کے طور پر کام کرتا ہے۔ اے ایس آئی کی اہم سرگرمیوں میں آثار قدیمہ کے باقیات کا سروے اور کھدائی، مرکزی طور سے محفوظ قرار دی گئی عمارتوں، مقامات اور باقیات کی دیکھ بھال، قدیم عمارتوں اور سلفیات کا کیمیاوی اعتبار سے تحفظ، قدیم عمارتوں کا عمارتی سروے، کتبوں کی تحقیق اور سکوں سے متعلق تحقیق کی ترقی، آثار کے عجائب گھروں کا قیام اور ان کی تنظیم نو، بیرون ملک آثار قدیمہ کی تلاش اور تکنیکی رپورٹ اور تحقیقی کاموں کی اشاعت کی تربیت شامل ہیں۔

قدیم عمارتوں، آثار قدیمہ اور باقیات کے ایکٹ 1958 کے تحت اے ایس آئی نے ملک میں 3667 مقامات کو قومی سطح کی اہمیت کے مقامات قرار دیا ہے جن میں سے 21 مقامات کو یونیسکو نے عالمی وراثت کی فہرست میں شامل کیا ہے۔

مرکزی طور سے محفوظ قرار دی گئی قدیم عمارتوں کے آس پاس کے ماحول کا رکھ رکھاؤ اور ترقی اے ایس آئی کا بنیادی کام ہے۔ مخصوص نوعیت کے ڈھانچوں کی مرمت اور روزمرّہ کے رکھ رکھاؤ کو ملک کے مختلف حصوں میں واقع 24 سرکل آفس سنبھالتے ہیں۔

قدیم عمارتوں کے ساتھ وابستہ ثقافتی سیاحت کی ترقی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے عالمی وراثت کی فہرست میں شامل اور دیگر اہم ان مقامات پر جہاں لوگ زیادہ تعداد میں جاتے ہیں، سیاحوں کے لیے ثقافتی سہولیات قائم کی گئی ہیں مثلاً معلوماتی سہولیات، جدید ٹکٹ سنٹرز، بہتر نشان دہی اور پینے کے پانی کی سہولت وغیرہ۔

اے ایس آئی نے ترجیحات اور مالی وسائل کی بنیاد پر عمارتوں کے بچاؤ، کیمیاوی تحفظ اور باغبانی کی سرگرمیوں کے لیے 1700 اسکیمیں چلائی ہیں۔ عالمی وراثت کے مقامات اور ان عمارتوں پر جہاں ٹکٹ لینا پڑتا ہے، سیاحوں کے لیے سہولیات کی فراہمی پر بھی زور دیا گیا ہے۔

جاپان بینک آف انٹرنیشنل کوآپریشن کی قرضہ جاتی مدد سے اجنتا ایلورا بچاؤ اور سیاحت کی ترقی کے پروجیکٹ کے پہلے مرحلے کی کامیاب تکمیل کے بعد دوسرا مرحلہ شروع کیا گیا ہے۔ اجنتا ایلورا، پتیل کھورا اور اورنگ آباد کی سرنگوں، دولت آباد قلعہ، بی بی کے مقبرے، پٹنہ دیوی مندر اور لونار گروپ کے مندروں کے بچاؤ، کیمیاوی تحفظ اور مجموعی ماحولیاتی ترقی کے لیے ایک جامع پروگرام دوسرے مرحلے میں 37.68 کروڑ روپے کی لاگت سے شروع کیا گیا ہے۔ اے ایس آئی نے اس پروجیکٹ پر مارچ 2009 تک 20.3 کروڑ روپے خرچ کیے ہیں جب کہ 10-2009 کے دوران اس کے لیے آٹھ کروڑ روپے کی رقم کا بندوبست کیا گیا ہے۔

اے ایس آئی، وزارت خارجہ کے آئی ٹی ای سی پروگرام کے تحت کمبوڈیا میں ٹاپروم مندر کے بچاؤ اور بحالی کے لیے بھی کام کر رہا ہے۔ اے ایس آئی اس مندر کے ڈھانچے زمینی تکنیک، پانی کے رکاؤ اور بہاؤ کے پہلوؤں کے بارے میں سائنسی مطالعات اور تحقیقات کرتا ہے۔ انٹرنیشنل کوآرڈی نیشن کمیٹی اور اے پی ایس، اے آر اے نیشنل اتھارٹی کی منظوری سے پروجیکٹ پر عمل درآمد کے پروگرام کے مطابق تین مقامات پر بچاؤ کا کام جاری ہے۔

آثار قدیمہ کی کھدائی:

اے ایس آئی نے 09-2008 کے دوران اپنے سرکلوں میں کھدائی کے کام بھی کیے ہیں۔ درج ذیل مقامات پر کھدائی کے قابل ذکر نتائج سامنے آئے ہیں:

بارہ بتی کا قلعہ، کٹک ضلع میں اور مہاساندی دریا کے دہانے پر واقع ہے۔ کھدائی کا کام بارہ بتی قلعے کے احاطے کے شمالی اور مشرقی حصے میں کیا گیا ہے۔ اس کھدائی کے نتیجے میں 4.30 میٹر موٹے آثار دریافت کیے گئے ہیں۔ یہ عمارتیں، لیٹرائٹ، کوھنڈالائٹ اور موٹے ریتیلے پتھر کو مٹی اور چونے کے مسالوں سے جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ دیواروں کی سطحوں پر چونے، کنکر اور سیپوں سے کیے گئے پلاسٹر بھی نوٹس کیے گئے۔

اس کھدائی میں جو نوادرات دریافت ہوئے ہیں، ان میں بیٹھی ہوئی دیوی، گندھرو، شیر کا ایک سر، دیپ کے ٹکڑے، گیند اور پتھر کے برتنوں کے ٹکڑے، چھینکے، مٹی کے جانوروں کے ٹکڑے، کلہاڑی اور لوہے کے اسٹول شامل ہیں۔ مٹی کے بنے برتنوں میں اناج رکھنے کے مٹکے، کامدار برتن، چراغ، برتن رکھنے کے اسٹینڈ، ٹونٹی دار ڈھکن، چھوٹے چھوٹے برتن، پلیٹیں اور پیالے، حقے کی چلم اور چینی پورسلین کے ٹکڑے بھی دریافت کیے گئے ہیں۔

بیگم پور گاؤں نالندہ مہاویار کے کھنڈرات سے شمال میں 1.4 کلومیٹر پر واقع ہے۔ وہاں بیگم پور گاؤں کے جنوب کی جانب ایک بڑا ٹیلہ ہے۔ بستی سے

تقریباً چار سو فٹ جنوب میں ایک بڑا چوکور ٹیلہ ہے، جس میں خستہ اینٹوں کی عمارتیں ہیں۔ اس پورے ٹیلے پر کھیتی ہوتی ہے اور اس کے مالک گاؤں والے ہیں۔ آج کل اس ٹیلے کا رقبہ تقریباً 300x300 میٹر اور آس پاس کی جگہوں سے اس کی اونچائی پانچ میٹر ہے۔

نالندہ ضلع میں گری یک پولیس اسٹیشن کے نزدیک گھورا کٹورہ نام کے آثار قدیمہ بہار شریف اور نوادا کے درمیان قومی شاہراہ نمبر 31 پر گری یک پولیس اسٹیشن سے تین سو کلومیٹر دور واقع ہیں۔ دریائے پنچنا اس جگہ سے مغرب کی جانب بہتا ہے اور تیودن جیٹھیا اور راج گیر جانے والی سڑک سے بھی ملتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا ٹیلہ ہے جو کہ شمال جنوب میں 900 میٹر کے قریب لمبا اور 500 میٹر مشرق مغرب میں پھیلا ہوا ہے اور 40 سے 500 فٹ تک اونچا ہے۔ اس کو سب سے پہلے بلوچانن نے دریافت کیا تھا۔ مقامی گاؤں والوں کے مطابق اس ٹیلے کے شمالی حصے پر حسن حسین کا مقبرہ تھا۔ اس ٹیلے کے مرکز میں ایک چھوٹا سا چوکور قلعہ تھا، جس کے چاروں کونوں پر برج تھے۔ یہاں جو برتن پائے گئے ہیں، وہ لال مٹی، کالی مٹی، این بی پی اور کالی دلال مٹی کی آمیزش والے ہیں۔ کچھ نادر اشیا بھی پائی گئی ہیں جیسے مٹی کے موتی، کھلونے اور سنگ کے پتھروں کے ٹکڑے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جگہ غالباً چالکولیتھک کلچر سے شروع ہوئی تھی اور سنگا کشان سے دور وسطٰی تک پھیل گئی۔

گوا میں سینٹ اگسٹائن کامپلیکس کی سرحدی دیواروں کی کھدائی کے دوران نلکے، پرنالے، پلیٹ فارم وغیرہ پائے گئے ہیں۔ اس احاطے سے باہر کے علاقے میں بہت سے نیلے اور سفید برتنوں کے ٹکڑے پائے گئے ہیں۔ بڑی تعداد میں ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کے انبار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علاقہ کوڑے دان کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہوگا، ٹوٹے ہوئے برتن کوڑے میں پھینک دیے جاتے تھے۔ باور کیا جاتا ہے کہ اسی جگہ جارجیا کی ملکہ کیتھرائن کی قبر بھی ہے۔

اے ایس آئی کے آگرہ سرکل نے اسی چھترا میں بھی اس مقام پر متعدد کھدائیوں کے حصے کے طور پر کھدائی کی۔ اسی چھترا میں بسنی کے اصل ٹیلے کے جنوب مغرب میں تین ٹیلوں کو منتخب کیا گیا۔ اس کھدائی سے تاریخی عہد کی عمارتوں کے آثار دریافت ہوئے ہیں۔ یہ کام ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ نے کانپور کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (آئی آئی ٹی) کے اشتراک سے کیا ہے۔

(بشکریہ "یوجنا" نئی دہلی، فروری 2010)

□□□

ہندوستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی. آر. گیڈگل، پروفیسر ایم. صدیقی

ہندوستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہوگئے بلکہ اسی کے بعد ہندوستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے ہی صحیح معنوں میں ہندوستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت -/130 روپے

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی.کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پوری کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت -/149 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

2009 کے نوبل انعام یافتگان

معاشیات:

Elenor Ostrom پہلی خاتون ہیں جنھوں نے معاشیات میں نوبل انعام حاصل کیا ہے۔ انھیں یہ انعام ملنے کی توقع کئی سال سے کی جارہی تھی۔ ان کے علاوہ اس سال معاشیات کا انعام امریکہ ہی کے Oliver Williamson نے بھی حاصل کیا۔ اوسٹروم کی تحقیق نے اس خیال کو غلط ثابت کردیا ہے کہ مشترکہ ملکیت کی جائیداد کا انتظام موثر طریقے پر نہیں کیا جاتا اور اس میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے ضابطوں کی ضرورت ہے۔

اس سال نوبل انعام حاصل کرنے والے دوسرے ماہر معاشیات پروفیسر Oliver Williamson کا تعلق بھی کیلیفورنیا یونیورسٹی برکلے سے ہے۔ انھوں نے بڑی فرموں کے بارے میں تحقیق کرکے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ درجہ بدرجہ اختیارات پر مبنی تجارتی کمپنیاں کنٹرول کے ایسے متبادل ڈھانچے پیش کرتی ہیں جن کے ذریعے مختلف قسم کا لائحہ عمل اختیار کیا جاسکتا ہے تاکہ مفادات کے ٹکراؤ کو دور کیا جاسکے۔

امن:

نوبل انعام برائے امن امریکہ کے صدر بارک اوباما کو عوام کی سطح پر بین الاقوامی سفارت کاری اور تعاون کو مستحکم کرنے کے لیے ان کی غیر معمولی مساعی کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔

طب:

طب کے شعبے میں نوبل انعام دو خواتین اور ایک مرد سائنس داں نے مشترکہ طور پر حاصل کیا۔ Jag W. Szoskak کا تعلق ہاورڈ ہیوز میڈیکل انسٹی ٹیوٹ بوسٹن سے ہے۔ Carol W. Greider جون ہوپکنس یونیورسٹی اسکول آف میڈیسن سے متعلق ہیں جب کہ Elizabeth Blackbum کیلیفورنیا یونیورسٹی سین فرانسسکو سے منسلک ہیں۔ انھوں نے یہ دریافت کیا ہے کہ کروموسوم کی حفاظت ٹیلومیرز اور اینزائم ٹیلومیرز کے ذریعے کس طرح کی جاتی ہے۔ اس دریافت کے ذریعے بوڑھا ہونے کے عمل، کینسر اور سٹم سیل سے متعلق متعدد سوالوں کے جواب حاصل ہوگئے ہیں۔

ادب:

ادب کا نوبل انعام رومانوی نژاد جرمن ادیبہ Herta Mueller نے حاصل کیا ہے۔ ان کی تحریر کردہ کہانیوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بنیادی حقوق سے محروم آزادیٔ اظہار کے لیے لڑنے والوں کی تصویر کشی شعر کے سے ارتکاز اور نثر کی واضح صاف گوئی سے کرتی ہیں۔

وہ 1953 میں رومانیہ کے شہر نز کی ڈورف میں پیدا ہوئیں جہاں جرمن بولنے والی اقلیت آباد تھی۔ 1945 میں بہت سے جرمن بولنے والے رومانویوں کو جلاوطن کردیا گیا۔ ان میں ان کی والدہ بھی شامل تھیں جنھوں نے یوکرین کے ایک مشقت کے کیمپ میں پانچ سال گزارے۔ اپنے ایک ناول میں ہرتا ملر نے اس زمانے کے جلاوطن کیے جانے والوں کی کہانی لکھی ہے۔

1973-1976 کے دوران انھوں نے ٹمس وار یونیورسٹی میں جرمن اور رومانوی ادب کا مطالعہ کیا۔ اس زمانے میں وہ جرمن بولنے والے نوجوان ادیبوں کے ایک حلقے میں بھی شامل ہوگئیں۔ جو صدر چاؤسکو کی آمریت کی مخالفت کرتا تھا اور اظہار رائے کا حق مانگتا تھا۔ تعلیم مکمل کرکے انھوں نے ایک فیکٹری میں بطور مترجم کام شروع کردیا۔ اس زمانے میں ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ خفیہ پولیس کے لیے مخبر کی حیثیت سے کام کریں۔ انھوں نے انکار کیا تو انھیں ملازمت سے برطرف کردیا گیا۔ جب ان کی مختصر کہانیوں کا پہلا مجموعہ مرتب ہوا تو اسے سنسر کردیا گیا۔ ان کی جو کہانیاں سنسر ہونے سے بچ گئیں وہ جرمنی میں شائع ہوئیں۔ کہانیوں کا ایک اور مجموعہ رومانیہ میں شائع ہوا۔ ان کہانیوں میں رومانیہ میں اس وقت برپا سیاسی تشدد، عدم رواداری اور بدعنوانیوں کا ذکر تھا۔ ان کی اشاعت پر رومانوی ذرائع ابلاغ میں انھیں سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا جب کہ مغربی جرمنی میں انھیں سراہا گیا۔

آخرکار 1987 میں وہ اپنے شوہر رچرڈ ویگنر کے ساتھ جو خود ایک ادیب تھے، جرمنی ہجرت کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ وہ جرمن زبان میں انیس کتابیں شائع کرچکی ہیں۔ ان میں سے پانچ کا انگریزی میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ ان کی کہانیوں اور ناولوں کے ترجمے فرانسیسی، ہسپانوی اور سویڈش میں بھی شائع ہوئے ہیں اور ان کی تخلیقات پر تنقید کی متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

کیمیا:

اس سال کیمسٹری کا نوبل انعام تین سائنسدانوں کو مشترکہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ سائنس دان اسرائیل کی Ada E. Yonath (وائزمین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس) امریکہ کے Thomas A. Steitz (ہاورڈ ہیوز انسٹی

ٹیوٹ، ییل یونیورسٹی) اور برطانیہ کے ہندوستانی نژاد Rama Krishnan Venkatraman (ایم آر سی لیبارٹری آف مولی کیولر بیالوجی، کیمبرج) ہیں۔ ان تینوں سائنس دانوں نے آر این اے اور متعلقہ لحمیات (ریبوسوم) کی ساخت اور فعل کے بارے میں تحقیق کی ہے۔ یاد رہے کہ یہ ریبوسوم ہی ہے جو ڈی این اے کوڈ کو حیات میں تبدیل کرتا ہے۔

طبیعات:

طبیعات کا نوبل انعام تین سائنس دانوں نے حاصل کیا۔ چین کے Charles Kuen Kao نے فائبر اوپٹکس پر اپنی تحقیق کے سلسلے میں بصری ابلاغ کے لیے فائبر میں روشنی کے گزرنے کے بارے میں اہم انکشافات کیے ہیں۔ امریکہ کی بیل لیبورٹریز، مرے ہل سے منسلک George Elwood Smith اور Williard Stering Boyle نے مشترکہ طور پر سی سی ڈی سنسر یا عکس اتارنے والا سیمی کنڈکٹر سرکٹ ایجاد کیا جس کی بدولت روشنی کو الیکٹرونک سگنلز میں تبدیل کرنا ممکن ہوگیا اور انٹرنٹ کے عہد میں داخل ہونے کی راہ ہموار ہوئی۔

ہیلری مینٹل نے بوکر انعام حاصل کیا:

اس سال انگریزی ادب کا مؤقر انعام بوکر پرائز برطانوی ناول نگار Hillary Mantel نے حاصل کیا ہے۔ انھیں یہ انعام ان کے ناول Wolf Hall پر دیا گیا ہے جو ہنری ہشتم کے دور کے تاریخی حقائق سے بھرپور ایک ایسی کہانی ہے جس میں اس زمانے کی سیاسی سازشوں کا ذکر ہے۔

اس سال بوکر انعام کے لیے نامزد کیے جانے والوں میں تین اور بڑے ادیب Sarah Waters، A.S Byatt اور J.M. Coetzee شامل تھے۔

دوسرے ناول نگار جن کی تخلیقات اس سال کی دس بہترین کتابوں کے انتخاب میں شامل تھیں:

Simon Mawer (The Glass Room): Adam Foulders (The Quickening Maze): Colm Tolbin (Brooklyn): Samantha Harvey (The Wilderness): James Scudamore (Heliopolis): Sarah Hall (How to Paint a Dead Man)۔

(بشکریہ اخبار "تحقیق"، پاکستان)

❑❑❑

ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاصِ وطن کی لڑائی پورے جوش و خروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت -/300 روپے

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی

غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق اور سلام کو اعتقاد کے طور پر انفرادیت حاصل ہے۔ یہ وہ اعتقاد ہے جس میں اخلاق، منقبتی، رثائی، مدحیہ اور بھکتی جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور کے سلام پر اعتقاد کی ہی فضا چھائی ہوئی تھی لیکن یہی صنف جب انیس تک پہنچی تو اس میں ایک جدید ادبی لب ولہجہ قائم ہوا۔ انیس نے سلام میں رثائی موضوعات کے علاوہ ذاتی مسائل، زمانے کی ناقدری، معاصرانہ چشمک اور بلند خیالی جیسے مضامین کو جگہ دی۔ ''انیس کے سلام'' مرتبہ علی جواد زیدی میں انیس کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں جس میں سلاموں کی تعداد 102 ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/60 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

سرورالہدیٰ

کلاسکی ادب

میر باقر حزیں

حنیف نقوی نے اپنی کتاب ''شعرائے اردو کے تذکرے'' میں کلیم الدین احمد کے مرتبہ ''دو تذکرے'' کی پہلی جلد کا سن اشاعت 1958 لکھا ہے میرے پاس جو نسخہ ہے اس میں 1959 درج ہے۔ شاید نقوی صاحب سے سہو ہوا ہے۔

میر باقر حزیں کا شمار مرزا مظہر جان جاناں کے اہم ترین شاگردوں میں ہوتا ہے۔ اردو کے تمام اہم تذکروں میں ان کا ذکر موجود ہے۔ میر باقر حزیں کب اور کہاں پیدا ہوئے، اس سلسلے میں کوئی یقینی بات سامنے نہیں آسکی۔ قائم، میر حسن اور عشقی نے انھیں اکبرآبادی بتایا ہے۔ شورش انھیں ساکن عظیم آباد لکھتے ہیں۔ حزیں کے تعلق سے تذکرۂ شورش کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شورش میر باقر حزیں کے شاگرد ہیں، لیکن تذکرۂ شورش کی دو روایات نے ہماری دقتوں میں اضافہ بھی کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت کے عظیم آباد کی علمی و ادبی صورتحال کو دیکھنے اور سمجھنے کا ایک اہم ماخذ تذکرۂ شورش ہے۔ کلیم الدین احمد نے ''دو تذکرے'' کے نام سے 1959 میں شورش اور عشقی کے تذکرے کو ایک ساتھ (مجلد) شائع کیا تھا۔ کلیم الدین احمد کا مرتبہ نسخہ، نسخۂ آکسفورڈ کے قلمی نسخے پر مبنی ہے۔ محققین اور ناقدین کی پرانی تحریروں میں کلیم الدین احمد کے اسی مرتبہ نسخے کا حوالہ ملتا ہے۔ محمود الٰہی نے تذکرۂ شورش کے جس قلمی نسخے کو مرتب کیا ہے وہ خانقاہ رشیدیہ جونپور سے انھیں حاصل ہوا۔ اس نسخے کو 1984 میں اترپردیش اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔ حنیف نقوی نے اپنی کتاب ''شعرائے اردو کے تذکرے'' میں ان دونوں مطبوعہ نسخوں کے استناد سے بحث کی ہے۔ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ محمود الٰہی کا مرتبہ نسخہ زیادہ معتبر ہے۔ محمود الٰہی ایک حساس محقق کی حیثیت سے لکھتے ہیں:

''یہاں میں یہ واضح کرتا چلوں کہ نسخۂ آکسفورڈ کے بعض بیانات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ یہ سب کچھ ہے مگر تذکرۂ شورش نہیں۔''
(تذکرہ شورش، مرتبہ: محمود الٰہی، ص۔12)

میر باقر حزیں کے تعلق سے کوئی باضابطہ تحقیقی کام سامنے نہیں آسکا۔ جمیل جالبی نے اختصار کے ساتھ ''تاریخ ادب اردو'' میں ان کا ذکر کیا ہے۔ مگر ایک عام قاری میر باقر حزیں کے نام اور کلام سے واقف ضرور ہوسکتا ہے۔ لہٰذا جمیل جالبی کی اس مختصر سی تحریر کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ جمیل جالبی نے بھی میر باقر حزیں کو تذکرۂ شورش کی مدد سے انھیں سامنے لانے کی کوشش کی ہے، اختر اورینوی نے اپنی کتاب ''بہار میں اردو زبان وادب'' کا ارتقا میں میر باقر حزیں کو ان شعرا کی فہرست میں جگہ دی ہے جو باہر سے آکر عظیم آباد میں آباد ہوئے۔ اختر اورینوی نے میر باقر حزیں کے بارے میں کوئی نئی تحقیق پیش نہیں کی۔ میر باقر حزیں کا سب سے تفصیلی مطالعہ اسما سعیدی نے پیش کیا جو ان کی مرتبہ کتاب دیوان حسرت عظیم آبادی کے پیش لفظ کا حصہ ہے، انھوں نے ''متعلقین حسرت'' کا ایک باب قائم کیا ہے جس میں میر باقر حزیں کے بارے میں اہم حقائق یکجا ہو گئے ہیں۔ بعض محققین کی آرا پر اسما سعیدی نے اپنی رائے دی ہے اور اخیر میں تمام تذکروں سے ان اقتباسات کو زمانی اعتبار سے پیش کیا ہے جو میر باقر حزیں سے متعلق ہیں۔ اسما سعیدی کا موضوع تو حسرت عظیم آبادی کی شخصیت اور شاعری ہے لیکن انھوں نے میر باقر حزیں سے ان کے رشتے کو بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ نشان زد کرنے کی کوشش کی ہے۔ حسرت عظیم آبادی، میر باقر حزیں کے شاگرد تھے۔ میر باقر نے پہلے حزیں تخلص اختیار کیا اور بعد میں ظہور۔ اسی لیے جمیل جالبی نے ''تاریخ ادب اردو میں''، ''حزیں'' کے ساتھ ''ظہور'' کا اضافہ کیا ہے تاکہ دونوں تخلص ایک ساتھ سامنے آجائیں۔ ''تذکرہ شورش'' میں ''حزیں'' اور ''ظہور'' کو حروف تہجی کے اعتبار سے جگہ دی گئی ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ ایک ہی شاعر کا ذکر حزیں اور ظہور کی شکل میں دو مقامات پر ملتا ہے۔ ''حزیں'' کے باب میں شورش نے میر اور گردیزی کے بیانات کو درج کر دیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی رائے نہیں پیش کی ہے۔ البتہ ''ظہور'' کے باب میں شورش نے ان کے والد، خاندان اور ان کے تعلق سے نئی معلومات فراہم کی۔ اگر شورش نے یہ معلومات فراہم نہ کی ہوتی تو میر باقر حزیں کی تلاش میں ہم اتنی دور تک نہیں آسکتے تھے۔ یہ بات حیرانی کی ہے کہ شورش ''حزیں'' کے باب میں میر اور گردیزی کے بیانات پر اکتفا کرتے ہیں اور ''ظہور'' کے تحت ہمارے علم میں کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کے مرتبہ تذکرۂ شورش میں ''حزیں'' کے باب میں وہی حقائق ملتے ہیں جو محمود الٰہی کے مرتبہ نسخے میں ''ظہور'' کے تحت درج ہیں۔ میر باقر حزیں کے سلسلے میں جو حقائق ان دو مطبوعہ نسخوں میں پیش کیے گئے ہیں وہ بڑی حد تک یکساں ہیں مگر انھیں یہاں ایک ساتھ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ پہلے کلیم الدین احمد کے مرتبہ تذکرۂ شورش کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''حزیں: شاگرد مرزا مظہر میر محمد باقر حزیں تخلص، خلف فخر اللہ خاں، ساکن عظیم آباد۔ بعد شہادت خاں موصوف تشریف بشہاں جہان آباد پر دہ عنبت خواجہ محمدی خاں صاحب غفرلہ رسیدہ۔ دور آمیخاد و دیوان بقیہ قلم در آوارده۔ لیکن

دیوان" ہم کہ در جواب انعام اللہ خاں یقیں مرحوم بودہ آن قلیل بود۔ بعد نادر شاہی و در وقت حکومت زین الدین احمد خاں بہادر، ہیبت جنگ سپہدار دہلی مراجعت نمودہ بعظیم آباد رسیدہ، در سرکار نواب موصوف نوکر گشتہ واز، شیرہ میر قدرت اللہ مغفور خلف حضرت شاہ شکر اکد خدا شدہ۔ تا زیست بہ عشرت و حرمت ماندہ۔ از دشت۔" (دو تذکرے، مرتب: کلیم الدین احمد، ص۔ 221)

میر محمد باقر: خلف فخر اللہ خاں ساکن عظیم آباد، بعد شہادت خاں موصوف تشریف بہ شاہجہاں آباد بردہ بخدمت برادر نسبتی خواجہ محمدی خاں صاحب غفر رسیدی و شاگرد مرزا مظہر گردیدہ، حزیں تخلص یافتہ، چنانچہ مشہور، معروف است کہ صاحب دیوان بودہ۔ آخر در وقت نواب زین الدین احمد خاں ہبت جنگ از دہلی مراجعت نمودہ، در سرکار نواب موصوف نوکر گشتہ، بسیار بعزت و حرمت اوقات بسری میبرد۔ دیوان دیگر ورڈھا کہ درست فرمودہ تخلص ظہور قرار دادہ چوں بارگ عظیم آباد آمدی۔ ساقی نامہ و ترجیع بند تصنیف نمودہ آخر، ہمراہ نواب صولت جنگ بوسیلہ میر محمد وحید صاحب قبلہ مغفور در پرینہ رفت و جاں بجاناں دادہ۔ در روضہ حضرت شاہ مصطفی جمال الحق قدس سرہ زیر جبوترہ جائے عدفت یافتہ۔ از دست۔

(تذکرہ شورش، مرتبہ محمود الٰہی، ص۔ 419-20)

محمود الٰہی کے مرتبہ تذکرہ شورش میں حزیں کے تعلق سے نادر شاہی حملے کا ذکر مقدمے میں آیا ہے۔ اور کلیم الدین احمد کے مرتبہ نسخے میں حزیں کے باب میں۔ جمیل جالبی اور کچھ دیگر محققوں نے میر باقر حزیں کے سلسلے میں نادر شاہ کی تباہ کاری کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نادر شاہی تباہ کاری کے بعد حزیں دہلی سے عظیم آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ جمیل جالبی نے اس مسئلے سے کوئی سروکار نہیں رکھا کہ حزیں عظیم آبادی ہیں یا اکبر آبادی، اسماء سعیدی نے حزیں کے دہلی قیام کے سلسلے میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے۔

"حزیں دہلی میں اتنی مدت تک رہے کہ انھیں لوگ دہلوی سمجھنے لگے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ خواجہ محمدی خاں دہلی میں فوج میں کسی بڑے عہدے پر مامور ہوں گے ممکن ہے حزیں بھی اس زمانے میں فوج میں رہے ہوں۔"

(دیوان حسرت عظیم آبادی، مرتبہ: اسما سعیدی، ص۔ 137)

حزیں کو دہلوی سمجھنے کی ایک بڑی وجہ ان کا دہلی میں ایک عرصے تک مقیم ہونا بھی ہوسکتا ہے۔ یہ وجہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے والد فخر اللہ دہلوی یا اکبر آبادی ہوں اور حزیں کی جائے پیدائش عظیم آباد ہو، قاضی عبدالودود کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"محمد باقر حزیں عظیم آباد سے غالباً حملہ نادری سے قبل ہی دہلی گئے تھے اور وہاں مرزا مظہر کے شاگرد ہوئے تھے..... حزیں نادر شاہی حملے کے بعد ہیبت جنگ کے عہد حکومت میں پٹنہ آئے تو یہ طرز ساتھ لائے۔ شورش شاگرد حزیں نے حزیں کے دو دواوین کا ذکر کیا ہے جو دہلی میں مرتب ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک دیوان یقین کے جواب میں تھا۔"

(نوائے ادب۔ اپریل، 2009، قسط سوم، ص۔ 65، بحوالہ دیوان حسرت عظیم آبادی، ص۔ 61)

قاضی عبدالودود کا یہ اقتباس بھی دیکھیے:

"حزیں کے شاگرد شورش کا قول ہے کہ حزیں پٹنہ سے دہلی گئے اور پھر وہاں سے پٹنہ آئے، ان کی وفات پورنیہ میں ہوئی۔ عظیم آباد سے ان کا سروکار کس قسم کا تھا اس کا پتہ نہیں، میرے نزدیک ان کا شمار مہاجرین میں صحیح نہیں۔ دہلی سے واپسی کے بعد پٹنہ میں سکونت اختیار کرنا بھی ثابت نہیں۔"

(ماہنامہ ضم، پٹنہ، بہار نمبر 1959)

قاضی عبدالودود یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ حزیں کا رشتہ عظیم آباد سے کس قسم کا تھا۔ لیکن یہ بات اہم ہے کہ وہ حزیں کو مہاجرین شعرا میں شامل کرنا نہیں چاہتے لیکن انھوں نے اس تعلق سے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ ان کا یہ خیال بھی حقیقت سے قریب ہے کہ دہلی سے واپسی کے بعد پٹنہ میں مستقل قیام بھی ثابت نہیں۔ میں نے حزیں کے سلسلے میں جتنی تحریریں دیکھی ہیں ان سب سے ایک کشمکش کا اظہار ہوتا ہے، حزیں کے خاندان سے متعلق اسما سعیدی نے پہلی مرتبہ کچھ نئے حالات فراہم کیے۔ دو تذکرے جلد دوم کے حوالے سے اسما سعیدی نے 'میر باقر حزیں' کے دو بیٹوں کا حال لکھا ہے۔

"ان کے ایک فرزند کا نام میر لطف علی اور ظاہر تخلص تھا۔ یہ فن سخن میں حسرت کے شاگرد تھے۔ جمعہ کے روز محفل شعر گوئی میں کی ہوگئی، تذکروں میں ظاہر کا حال اور کلام نہیں ملتا شورش نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے صاحبزادے میر مراد علی کا ذکر عماد السعادت میں قتل مختار الدولہ کے ذیل میں آیا ہے، مختار الدولہ کو بسنت نے قتل کیا تھا۔ اس قتل میں میر مراد علی کا بھی ہاتھ تھا۔ سعادت علی خاں کو مختار الدولہ سے بدگمانی ہوگئی تھی۔ انھیں کے ایما پر یہ قتل ہوا تھا۔"

(دیوان حسرت عظیم آبادی، مرتبہ: اسما سعیدی، ص۔ 141)

اسما سعیدی نے حزیں کے دوسرے بیٹے میر مراد علی کی یہ تفصیلات "عماد السعادت" سے حاصل کی ہیں۔

میر باقر حزیں کی اہمیت نہ تو اکبر آبادی ہونے میں ہے اور نہ عظیم آبادی۔ ان کی جائے پیدائش کا اگر یقین ہو جائے تو بھی حزیں کی شاعری ہی ان کا بنیادی حوالہ بنے گی۔ اس حقیقت کا سب نے اعتراف کیا ہے کہ حزیں کی کوششوں سے عظیم آباد میں اردو شاعری کی فضا اگر قائم ہوئی ہے۔ حزیں کے جتنے شاگرد عظیم آباد میں ہوئے اتنے کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئے، تھوڑے سے فرق کے ساتھ اشرف علی خاں فغاں بھی عظیم آباد تشریف لائے لیکن انھیں وہ قیادت حاصل

نہیں ہوئی۔ فغاں تو حزیں کے مقابلے میں عظیم آباد میں زیادہ رہے وہیں ان کی شادی ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔ لہٰذا اٹھارہویں صدی کا عظیم آباد علمی و ادبی اعتبار سے اگر روشن اور تابناک دکھائی دیتا ہے تو اس میں بہت بڑا حصہ میر باقر حزیں کا ہے۔ اٹھارہویں صدی کی اردو غزل کے تین اسالیب کا ذکر کرتے ہوئے عموماً میر، میر درد اور سودا کا نام آتا ہے۔ ان شعرا کی اہمیت کا اعتراف ہر زمانے میں کیا گیا۔ مگر مجموعی طور پر اس عہد کی اردو غزل ان ہی شعرا تک محدود نہیں ہے۔ مظہر جان جاناں کے شاگردوں کی تاریخی اہمیت ہے۔ تاباں، یقیں اور حزیں، فغاں، بیان بھی اسی سلسلے کے شاعر ہیں، جن سے اردو غزل میں وسعت کے ساتھ ساتھ سادہ بیانی آئی۔ تاباں فغاں یقین اور بیان کے دواوین شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن میر باقر حزیں کے مطبوعہ دیوان یا قلمی نسخے کا آج تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ حزیں کے دیوان کی دستیابی کے بغیر اٹھارہویں صدی کی اردو غزل کی تاریخ مکمل نہیں ہوگی۔ حسرت موہانی نے انتخاب سخن میں میر باقر حزیں کی غزلوں کا بھی انتخاب پیش کیا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ حسرت موہانی کو حزیں کی یہ غزلیں کہاں سے دستیاب ہوئیں۔ جمیل جالبی کا خیال ہے کہ حسرت کے پیش نظر حزیں کا وہ دیوان تھا جو یقین کے جواب میں ترتیب دیا گیا تھا۔ حزیں نے اپنے شعر میں انعام اللہ خاں یقین سے اپنی عقیدت کا یوں اظہار کیا ہے۔

طرز دیوان یقیں کی سخت مشکل ہے حزیں
دل کو خوں کیجے تب ایسی فکر رنگیں کیجے

اس عقیدت مندی اور اعتراف کے بعد میر باقر حزیں کے دوسرے دیوان کو انعام اللہ خاں یقین کے دیوان کے جواب میں تیار کرنے کی روایت کچھ مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ تذکرۂ شورش کے دونوں مطبوعہ نسخوں میں حزیں کے اشعار کو حروف تہجی کے اعتبار سے درج کیا گیا ہے۔ اس التزام سے یہ بات قرین قیاس ہے کہ حزیں کا دیوان مرتب ہو چکا تھا۔

میر باقر حزیں کی چند غزلوں اور متفرق اشعار کے مطالعے سے ان کے لیے سادہ بیانی، صفائی اور برجستگی جیسے الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ میر باقر حزیں کے یہاں بھی وہی مضامین ملتے ہیں جو اس عہد کے دیگر شعرا کے یہاں ملتے ہیں۔ میر باقر حزیں کا اگر دیوان سامنے ہوتا تو ان کے بارے میں زیادہ ذمے داری سے کوئی بات کہی جا سکتی تھی، لیکن ان متفرق اشعار سے ان کی شاعری کا ایک نمایاں رنگ سامنے آ جاتا ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ میر باقر حزیں نے بعض مضامین کو رسمی اور رواجی طور پر برتا ہے۔ اس سلسلے میں میر کا کارنامہ یہ ہے کہ ان کے یہاں ایسے مضامین ان کے اندرون ذات کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ میر نے جہاں کہیں کسی مضمون کو رسمی اور رواجی طور پر برتا ہے وہاں بھی کوئی نہ کوئی حسن کا پہلو موجود ہے۔ لیکن میر کے ہم عصر شعرا کے بغیر ہماری کلاسیکی غزل کا منظر نامہ مکمل بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان شعرا کو میر، سودا اور درد کے ساتھ رکھ کر دیکھا تو جا سکتا ہے مگر یہ بات ملحوظ رہے کہ تقابل اور موازنے کا عمل ان شعرا کی مجموعی خدمات سے کہیں ہمیں غافل نہ کر دے۔

میر باقر حزیں کے یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔ یہ اشعار مختلف تذکروں سے منتخب کیے گئے ہیں۔

خوب بوجھا ہے مزا عشق میں رسوائی کا
معتقد جی سے ہوں اس دل کی میں دانائی کا
دلبروں میں سے لیا ڈھونڈ جن تجھ سے کو
میں دوانہ ہوں ان آنکھوں کی شناسائی کا

سر جھکا دیں گر تواضع سے بتاں کچھ عیب نیں
شاخ گل ہے اس نزاکت ساتھ سرتاپا ادب
برق سے جوں آنکھ مند جاوے، کرے ہیں اس طرح
دیکھ کر حق کی تجلی مردم بینا ادب

مری رنگیں کلامی کا ہے وہ گل پیرہن باعث
کہ ہو ہے بلبلوں کی خوش نصیبی کا چمن باعث
کوئی ہوتا ہے سنگ سینہ خسرو سے رقیبوں کا
ہوا ناحق ہلاک اپنے کا آپ ہی کوہکن باعث
جو ہوتا ہے کسو سے انس سب سے وحشت آتی ہے
مری صحرا نشینی کا ہے میرا من ہرن باعث

کیوں کہ خاطر خواہ دل کے درد کی تقریر ہو
کب یہ معنی لفظ میں آتے ہیں، کیا تحریر ہو
بے طرح ہم مبتلا پاتے ہیں خوباں کا اسے
دیکھیے اب اس دوانے دل کی کیا تدبیر ہو

کچھ کٹے ہجر میں کچھ وصل میں گریاں گذرے
کیا مری عمر کے اوقات پریشاں گذرے
شان مجنوں کی کسو کی نہ رہی نظروں میں
فیل آہو میں جو ہم چاک گریباں گذرے

میں چاہتا ہوں عشق چھپاؤں پہ کیا کروں
رسوا کرے ہے خلق میں یہ چشم تر مجھے
سب آرزوئیں دل کی ٹھکانے لگیں حزیں
گر قتل کر چکے وہ سپاہی پسر مجھے

ایک دن دریا نے دیکھا تھا مرے رونے کا جوش
روز و شب غیرت سے ہوتا ہے تہ و بالا ہنوز
کوہ کن کی محنتیں آخر ٹھکانے لگ گئیں
دل میں کی شیریں کے جا آخر کے تیں سر چیر کر
کریں کیوں کر نہ ہم مجنوں کا ماتم
کہاں ملتے ہیں اپنے فن کے استاد
آرزوئیں عشق کی ہوتے نہ دیکھی سربراہ
کوہ کن بھی سر پٹک کر مر رہا آخر وہیں

دیا تلخی سے جی فرہاد نے یہ کہہ کے یا قسمت
لکھا یہ تھا کہ شیریں سے ملیں گے ہم قیامت کو

یہ آہو رام تھے مجنوں کے سب لیلیٰ کی خاطر سے
وگر نہ ان پری زادوں کو دیوانے سے کیا نسبت

غم نے آباد کیا خانۂ ویراں میرا
ابر مژگاں سے ہوا سبز بیاباں میرا

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi-25

کلیات رشید احمد صدیقی جلد اول (آپ بیتی)

مرتب: پروفیسر ابوالکلام قاسمی

رشید احمد صدیقی اردو کے صاحب طرز نثر نگاروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ قومی اردو کونسل نے ان کی تمام نثری تحریروں کو کلیات کی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جس میں صدیقی صاحب کی مشہور کتاب "آشفتہ بیانی میری" کے علاوہ وہ تمام تحریریں یکجا کردی گئی ہیں جو ان کی آپ بیتی کے ذیل میں رکھی جاسکتی ہیں۔

صفحات: 235، قیمت -/174 روپے

انسانی حقوق

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 23 دسمبر 1994 کو یہ اعلان کیا تھا کہ یکم جنوری 1995 کو شروع ہونے والی دہائی انسانی حقوق سے متعلق تعلیم کی دہائی ہوگی اور اس مدت میں انسانی حقوق کے فروغ کے لیے کوشاں تمام اداروں، تنظیموں، ذرائع ابلاغ، وکلا اور دیگر لوگوں سے اپیل کی جائے گی کہ وہ انسانی حقوق کے بارے میں معلومات کو موثر انداز میں لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس کتاب میں انسانی حقوق سے متعلق تمام ضروری اور اہم معلومات یکجا کردی گئی ہیں۔

صفحات: 497، قیمت -/430 روپے

تبصرات ماجدی

مرتب: عبدالعلیم قدوائی

مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام ایک عالم دین ادیب، ایک صاحب طرز انشا پرداز اور ایک صاحب نظر صحافی کی حیثیت سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انھوں نے ادب، فلسفہ، سوانح، تنقید، سیرت، تفسیر، ترجمہ ہر شعبے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ اس کتاب میں مولانا موصوف کے ادبی تبصرے یکجا کردیے گئے ہیں جنھیں پڑھ کر بیسویں صدی کے ادبی اکتسابات کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

صفحات: 472، قیمت -/277 روپے

سائنس اور راج

مصنف: دیپک کمار، مترجم: سہیل احمد فاروقی

اس کتاب میں نوآبادیاتی ماحول میں سائنس کے ارتقا، اس کے سماجی مضمرات، معاشی پیچیدگیوں اور ان سب کے ذیلی اثرات کی جستجو کی گئی ہے اور اس جستجو کے ذیل میں تکنیکی تقاضوں اور نوآبادیاتی ضرورتوں کے درمیان رشتوں کی نوعیت اور نوآبادیاتی طریقہ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ گذشتہ صدی کے ہندوستان میں تاریخ، سائنس اور حکومت کے مثلث، اس کے نشیب و فراز اور رفتار و روش کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

صفحات: 361، قیمت -/237 روپے

اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات

مصنف: شمشاد حیدر زیدی

اردو شاعری میں مرثیے کی جو اہمیت ہے اور اس نے اظہار و اسلوب اور موضوعات کے دائرے کو جو وسعت دی ہے اس کے سبھی معترف اور مداح ہیں۔ لیکن یہ بھی ہوا کہ مرثیے کی مذہبی حیثیت کو زیادہ اہمیت دی گئی اور ادبی قدر و قیمت پر کم توجہ کی گئی۔ شاید ایسا اس لیے ہوا کہ مرثیے پر لکھنے کے لیے قرآن، احادیث، تاریخ اور اسلامی روایات سے مکمل آگاہی ضروری ہے۔ اس کتاب میں مرثیہ گوئی کے آغاز سے موجودہ دور تک کے مرثیوں کا ادبی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات: 344، قیمت -/227 روپے

دنیا میں ایڈس

مصنف: جعفر محمود

ایڈس ایک ایسی بیماری ہے جو ایک نئے مہلک وائرس HIV کے ذریعے پھیلتی ہے۔ ابھی تک اس بیماری کی نہ تو کوئی موثر دوا ایجاد ہوئی ہے اور نہ ہی ایسا کوئی ٹیکہ جو اس سے انسانی جسم کو محفوظ رکھ سکے۔ یہ صحت عامہ کے لیے ایک تشویشناک مسئلہ بن چکا ہے اسی لیے اس کے تئیں بیداری پیدا کرنے کی فوری ضرورت ہے۔ اس کتاب میں HIV اور ایڈس سے متعلقہ ان تمام باتوں کا احاطہ کیا گیا ہے جن کا جاننا اس خطرناک مرض سے بچنے کے لیے ضروری ہے۔

صفحات: 425، قیمت -/456 روپے

اقبال محی الدین

جدید سائنسی ترقیات اور ہماری زندگی

سائنس اور ہماری زندگی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں کیونکہ ہر شعبۂ حیات میں ترقیات، عمدہ صحت، غذائی مسائل کا حل، نقل وحمل کی آسانی وغیرہ سائنسی ترقیات کی ہی دین ہیں۔ ذیل میں قومی و بین الاقوامی سائنسی ترقیات کا ذکر کیا جارہا ہے تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ دنیا میں جدید سائنسی ترقیات کیا کیا اور کہاں کہاں ہو رہی ہیں اور ان کا ہماری زندگی سے کتنا گہرا تعلق ہے:

سطح سمندر پر کھیتی کرنے کی تکنیک:

سطح سمندر پر امریکہ اور جاپان نے کھیتی کرنے کا تجربہ کیا اور چقندر کی کھیتی کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کی تکنیک یہ تھی کہ پہلے Polystyrene Rafts کی ایجاد ہوئی جس کی وجہ سے سمندر کی سطح پر کھیتی کرنا ممکن ہو سکا۔ اس پولسٹرین ریفٹ کے اوپر پلاسٹک گاز (Plastic Gauze) لگایا جاتا ہے تاکہ وہ فصلوں کی جڑوں کے لیے ایک سہارا بن جائے۔ پولسٹرین ریفٹ پانی پر تیرتے ہیں۔ یہ واٹر پروف ہوتے ہیں اور پلاسٹک گاز کی مدد سے ان پر فصلیں، خاص طور سے چقندر کی پیداوار کی جاتی ہے۔ یہ کھیتی سمندر پر اس لیے شروع کی گئی تاکہ زمین پر سے کھیتی کا حد سے زیادہ دباؤ ہٹ جائے۔

الیکٹرونک اخبار:

مستقبل کا اخبار Electronic Newspaper ہوگا جو نرمی رنگ کا پلاسٹک کا ٹکڑا ہوگا۔ جس کو Tablet کے نام سے جانا جائے گا۔ اس کو جب انگلی سے چھوا جائے گا تو اخبار کا پہلا ورق چھپی ہوئی شکل میں سامنے آجائے گا۔ اخبار کے پلاسٹک ٹکڑے پر Liquid Crystal Display (LCD) لگا ہوگا جس کے چھونے سے اخبار کے اوراق بدلتے جائیں گے۔ اس طرح لمبے چوڑے اخبار کے سارے مواد ایک پلاسٹک کے ٹکڑے میں سمو دیا گیا ہے۔

Roger Fidler جو اس الیکٹرونک اخبار کے موجد ہیں، انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ Tablet بہت جلد کامیاب ہو کر امریکہ اور دنیا کے دوسرے ممالک میں رائج ہو جائے گا امید ہے یہ Tablet جلد ہی ہندوستان میں بھی آجائے گا۔ اس Tablet کو اور زیادہ بہتر بنایا جارہا ہے تاکہ اس کی قیمت اتنی کم ہو جائے کہ عوام میں مقبول ہو سکے۔

سمندری راستے کی تعمیر:

ممبئی کو ہندوستان کی معاشی راجدھانی تصور کیا جاتا ہے جہاں روزی روٹی کمانے کے لیے ملک کے کونے کونے سے لوگ جاتے ہیں۔ لہٰذا ہر طرف ایک جم غفیر نظر آتا ہے۔ سڑکیں ٹریفک سے بھری رہتی ہیں۔ لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ اس دشواری کو دور کرنے کے لیے حکومت نے طے کیا کہ ممبئی کے اہم مقامات کو سمندری راستے سے اگر جوڑ دیا جائے تو فاصلہ اور وقت دونوں کم ہو جائیں گے اور لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جلدی پہنچنے میں آسانی ہو جائے گی۔ حکومت نے طے کیا کہ پہلے باندرہ اور ورلی کو سمندری پل کے ذریعے جوڑ دیا جائے۔

لہٰذا اب ممبئی کے پاس اکیسویں صدی کی اپنی ایک امتیازی پہچان ہے، جسے لندن میں مقیم ایس سری نواسن نے ڈار کنسل ٹینٹس (Dar Consultants) (یو.کے.) کے لیے ڈیزائن کیا ہے اور ہندوستان کنسٹرکشن کمپنی نے تعمیر کیا ہے۔ سمندر میں بنایا گیا یہ باندرہ۔ ورلی پل انجینئرنگ کا عظیم کارنامہ ہے۔ جس کو ہندوستان کے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کے نام موسوم کیا گیا ہے۔ اس سمندری راستے کے مرکز میں دو نہایت پُرشکوہ عمودی تختہ نما ڈانڈے ہیں جن سے چمکدار تاروں کا ایک جال ایسے لٹکتا ہے جیسے کٹھ پتلی کے تماشے کی ڈور کھیل دکھانے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ تار دن میں سورج کی روشنی اور رات میں زرق برق روشنیوں سے چمکتے رہتے ہیں۔ بہت کم وقفے میں اس سمندری پل نے اپنے خوبصورت ڈیزائن اور کارآمد انجینئرنگ کی وجہ سے شائقین کا دل موہ لیا ہے۔

ڈار کنسل ٹینٹس (یو.کے.) میں ایس سری نواسن اور ان کے ساتھیوں نے 600 میٹر لمبے باندرہ پل اور 128 میٹر اونچے ٹاورس اور 350 میٹر لمبائی والے ورلی پل کے ڈیزائن میں حفاظت، کارکردگی اور خوبصورتی کا زبردست امتزاج پیش کیا ہے۔ اس پل میں کنکریٹ کے فرش پر ٹریفک کی آٹھ لائنوں کی جگہ ہے اور بعید ساحل حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسے بہترین بین الاقوامی معیار کے حساب سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ٹریفک کی رہنمائی، ہنگامی حالات سے نمٹنے اور نقل وحمل پر نظر رکھنے کے لیے خود کار جدید ترین نظام یہاں لگایا گیا ہے۔ باندرہ۔ ورلی کا یہ سمندری راستہ (جو کہ اگلے مرحلے میں حاجی علی تک لے جایا جائے گا) ویسٹرن فری وے سمندری پروجیکٹ کا کلیدی حصہ ہے جس کا مقصد ممبئی میں ذرائع نقل وحمل کو بہتر بنانا ہے۔

جینیٹک انجینئرنگ اور بائیوٹیکنالوجی:

جینیٹک انجینئرنگ اور بائیوٹیکنالوجی تیسری دنیا کے لیے ایک نیا سائنسی

دور لے کر آئی ہے۔ ICGEBT (دہلی) اور دوسرے سینٹر TRIESTE (اٹلی) نے مل کر تیسری دنیا کی سائنسی خلیج کو پُر کر دیا ہے۔ ICGEBT ہندوستان کو دیا گیا جبکہ دوسرے دنیا کے ممالک اس سینٹر کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ شروع میں اس سینٹر کو جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کیمپس، نئی دہلی میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کی نئی عمارت تعمیر ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب یہ سینٹر وہاں منتقل کر دیا گیا ہے۔

یہ سینٹر بن جانے کے بعد ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ دنیا کے اس حصے میں سب سے بڑا ریسرچ اور ترقیات کا سینٹر ہوگا۔ حکومتِ ہند نے اس سینٹر کو 20 کروڑ روپئے دیے ہیں تاکہ زمین، عمارت اور دوسری سہولتیں مہیا ہو سکیں۔ چونکہ اس بین الاقوامی سینٹر کے کھولنے کا خیال UNIDO نے دیا تھا لہٰذا وہ بھی اس کی مدد کرتا رہے گا۔

ICGEBT کا آدھا سینٹر ہندوستان میں ہے اور دوسرا آدھا اٹلی کے TRIESTE شہر میں قائم کیا گیا ہے۔ یہ دونوں مراکز مل کر اپنے اپنے طے شدہ سائنسی میدان میں کام کرتے رہیں گے۔ ہندوستان کا مرکز یہاں کی ضرورتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے کام کرے گا۔ یہ سینٹر آبادی روکنے، غذائی پیداوار، انسانی صحت عامہ اور جانوروں کی صحت برقرار رکھنے پر کام کرے گا۔ جبکہ اٹلی کا تحقیقی مرکز انڈسٹریل مائیکرو بایولوجی اور روایتی و غیر روایتی توانائی پر کام کرے گا۔

یہ دونوں بین الاقوامی مراکز مل جل کر تیسری دنیا کے مسائل پر بھی سائنسی تحقیق کرتے رہیں گے تاکہ بائیوٹیکنالوجی کے ذریعے ان کا حل تلاش کیا جا سکے۔

دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے مسائل کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس مرکز کے منتظمین نے ایپلائڈ سینٹر بھی قائم کیے ہیں۔ اس طرح کے نیٹ ورک کے قائم ہونے سے سائنس دانوں کا آپس میں ملنا جلنا اور مسائل پر تبادلۂ خیال آسان ہو جائے گا۔ اس میں نہ صرف ہندوستان اور اٹلی بلکہ ساری دنیا کے جینیٹک انجینئرنگ اور بائیوٹیکنالوجی کے ماہرین آپسی تبادلۂ خیال سے مسائل کا حل جلدی اور آسانی سے تلاش کر سکیں گے۔

ان دونوں مراکز کا قیام تیسری دنیا کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ تیسری دنیا کے مسائل اور ان کے سائنسی حل کے علاوہ یہ دونوں مراکز Crippling Technology کی خلیج کو بھی پُر کر سکتے ہیں جس کے لیے UNIDO نے ان مراکز کو قائم کیا ہے۔

تیسری دنیا میں جہاں غذائی حالت نازک ہے زراعت بائیوٹیکنالوجی کے ذریعے فروغ حاصل کر سکتی ہے۔ سبز انقلاب نے ان ممالک میں فاقہ کشی سے نجات ضرور دلائی ہے مگر اب بھی زراعتی مسائل کا مستقبل حل نہیں نکالا جا سکا ہے۔ ICGEBT زراعتی مسائل کا حل نکالنے میں بہت معاون ثابت ہوگا۔

اس بین الاقوامی مرکز یعنی International Centre for Genetic Engineering And Bio-Tehcnology (ICGEBT) میں جینیٹک انجینئرنگ پر بھی تحقیقی کام ہو رہا ہے۔

اس بین الاقوامی مرکز میں صحت سے متعلق بھی تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ ایڈس، یرقان اور ملیریا جیسی خطرناک بیماریوں سے بچاؤ پر تو تحقیقی کام کیا جا رہا ہے اس میں اس مرکز کو بہت کامیابی ملی ہے۔

نیوٹریشن پر سائنسی تحقیقات:

نیوٹریشن سائنس دانوں (Nutrition Scientists) نے اپنی حالیہ ریسرچ کے ذریعے یہ انکشاف کیا ہے کہ کھانے میں گرم مسالے کے استعمال سے کینسر جیسے موذی مرض سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ پیاز، لونگ، سرسوں، منگریلے کے بیج، دھنیہ اور میتھی اور دوسرے گرم مسالوں کے استعمال سے کینسر اور حملہ آور بیکٹیریا سے بچاؤ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں Anti-Inflammatory خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف نیوٹریشن (NIN) حیدرآباد نے اپنی ریسرچ رپورٹ میں کہا ہے کہ زیادہ تر گرم مسالے، کینسر اور نقصان پہنچانے والے بیکٹیریا کو اور خون میں شکر کے لیول کو ختم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کولسٹرول کو کم کرتے ہیں۔ NIN نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ ہلدی جو کہ سبزیوں اور دالوں میں ڈالی جاتی ہے وہ اینٹی کینسر ایجنٹ کا کام کرتی ہے۔ وہ مادّے جو کینسر بناتے ہیں ان کو MUTAGENS کہتے ہیں۔ ان کو ختم کرنے کے لیے گرم مسالے اور خاص طور سے ہلدی بہت مفید ہے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف نیوٹریشن کے سائنس داں ڈاکٹر Kalpagam Polsasa کا کہنا ہے کہ اگر 1.5 گرام ہلدی دو ہفتے تک روزانہ استعمال کی جائے تو جو لوگ سگریٹ پیتے ہیں ان کے پیشاب میں Mutagens کی مقدار کم کی جا سکتی ہے۔ کچھ ایسی سبزیاں بھی ہیں جو کینسر ہونے سے روکتی ہیں۔ مثلاً بند گوبھی، سرسوں، گوبھی اور بروکولی۔

نئی سائنسی تحقیق:

نیچر میٹریلس نامی رسالے میں چھپی ایک رپورٹ کے مطابق ایک نئے مادّے کے جوہری اثرات کا اگر لیزر شعاعوں سے امتزاج کیا جائے تو دیوار یا پتھروں جیسی سطحوں کے پیچھے کی چیزوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ امپریل کالج، لندن اور یونیورسٹی آف نیوچیٹل سوئٹزرلینڈ کے سائنس دانوں کی وضع کردہ اس تکنیک کی مدد سے زلزلے سے متاثرہ علاقوں میں ملبے وغیرہ کے آر پار دیکھ کر قیمتی جانوں کو بچایا جا سکے گا۔ ہڈیوں کی آڑ میں چھپے اندرونی اعضا کا بھی اس تکنیک سے مشاہدہ کیا جا سکے گا جنھیں فی الحال ایکسرے کے ذریعے نہیں دیکھا جا سکتا۔

اس تکنیک کی دریافت کو ایک اہم سائنسی انکشاف سے تعبیر کیا جا رہا ہے کیونکہ نامور سائنس داں آئنسٹائن کے بعض بصری نظریات کی واضح نفی سے ہی مذکورہ نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ آئنسٹائن کا ماننا تھا کہ لیزر شعاعیں تبھی کام کرسکتی ہیں جب بصری معمول یعنی کرسٹل یا شیشے جیسے مادّوں کو ایک مخصوص کیفیت میں لایا جائے، لیکن کوانٹم طبیعیات کے ماہرین ہمیشہ سے دعویٰ کرتے آئے تھے کہ اگر ایٹمی لہروں کی ترتیب میں تبدیلی کی جائے تو روشنی کی قوت میں اضافہ رونما ہوسکتا ہے۔ اس نظریے کی صداقت گیسوں میں ثابت شدہ تھی، لیکن ٹھوس مادّوں میں یہ اثر پہلی مرتبہ دیکھا گیا۔ یہ سائنسی تحقیق ہماری زندگی کے لیے بیحد مفید ثابت ہوگی۔

سبز اینٹیں:

برطانوی سائنس داں آج کل ایک ایسے تعمیراتی پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں جس کے تحت عمارتی اجزا سَن کے پودے اور اس کے ریشوں سے حاصل کیے جا رہے ہیں۔ بلڈنگ ریسرچ اسٹیبلشمنٹ کے زیر سرپرستی چلائے جا رہے اس پروجیکٹ کا مقصد صفر کاربن عمارتی ٹیکنالوجی کا فروغ ہے۔ اس پروجیکٹ کے لیے بنائے جا رہے جدید ترین ٹیکنالوجی والے عمارتی بلاکس نہ صرف تبدیلیِ آب و ہوا میں مزاحم ہوں گے بلکہ دیہی معیشت کے فروغ میں بھی معاون ہوں گے۔

سَن کے پودے سے حاصل ہونے والے ریشے ہلکے تو ہوتے ہی ہیں، وہ بہت تیزی سے بڑھتے بھی ہیں۔ ان ریشوں کو یکجا کرکے چونے سے تیار کردہ ایک گوند سے انھیں جوڑا جاتا ہے۔ سَن کا پورا اپنی تیز رفتار نشوونما کے دوران ماحول سے کاربن جذب کرتا ہے اور چونکہ چونے کی تیاری میں نہایت کم کاربن صرف ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ ان بلاکس میں گرمی اور ٹھنڈک کے روکنے کی بھی صلاحیت ہے، یہ بلاکس صفر کاربن مادّوں جیسی خصوصیات رکھتے ہیں۔

بلڈنگ ریسرچ اسٹیبلشمنٹ (BRE) کے مرکز برائے جدید عمارتی اجزا کے پروفیسر پیٹ واکر کہتے ہیں ''ہم روایتی اجزا کی جگہ عمارتوں کی تعمیر میں سَن کے استعمال کو فروغ دے رہے ہیں تاکہ سبز تعمیراتی مادّوں کا استعمال بڑھ سکے۔'' انھوں نے کہا کہ بہ آسانی دوبارہ قابل کاشت فصلوں سے بنایا جانے والا عمارتی ساز و سامان نفع کا سودا ہے کیونکہ اگر ہم ایک فٹ بال میدان جتنی جگہ میں سَن کی کاشت کرتے ہیں تو اس سے چار کمروں والا ایک مکان صرف چار مہینوں کی پیداوار سے تعمیر کیا جاسکتا ہے۔

اس تین سالہ پروجیکٹ پر تقریباً ساڑھے سات لاکھ پاؤنڈ کا خرچ آیا ہے اور اس سے حاصل شدہ سائنسی و تکنیکی نتائج مکانات کی تعمیر میں نہایت معاون ہوں گے۔

نینو تحقیق کے میدان میں پیش رفت:

سائنس داں نینوٹکنالوجی کی مدد سے ایسی ننھی منّی ایکسرے مشینیں بنانے کی کوشش میں ہیں جن کے ذریعے کسی واحد سالمے تک کی شناخت اور تصویر کشی کے عمل کو ممکن بنایا جاسکے گا۔ آئندہ دس برسوں کے اندر انسانی جسم میں موجود وائرسوں کے نقل و حمل کی جانچ پڑتال کے لیے ڈاکٹر ایسی چھوٹی مشینوں کا استعمال کرسکیں گے جن کو بہ آسانی ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جایا جاسکے گا لیزر شعاعوں والی ان ایکسرے مشینوں کی مدد سے سالموں کی ہیئت میں تبدیلی وغیرہ کا پتہ لگانا ممکن ہوسکے گا۔

نینوٹکنالوجی جدید سائنس کی ایسی شاخ ہے جو خوردبینی سطح پر انتہائی کارآمد ٹکنالوجی فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایک نینومیٹر لمبائی، ایک میٹر کے سو کروڑویں حصے کو کہتے ہیں، چنانچہ نینوٹکنالوجی کی مدد سے بے انتہا چھوٹے آلات کی ایک خوش آئند دنیا کا تصور سامنے آیا ہے۔ برطانیہ نے اس میدان میں زبردست پیش رفت کی ہے۔ دو سال قبل برطانوی حکومت کی جانب سے ایک خصوصی مہم کے تحت برطانوی یونیورسٹیوں میں نینو سائنس سنٹر قائم کیے گئے تھے۔ حال ہی میں برطانوی کمپنیوں کی جانب سے کئی انقلابی مصنوعات بازار میں متعارف کی گئی ہیں جن کو نینوٹکنالوجی کی مدد سے بنایا گیا ہے۔ یونیورسٹی آف ساؤتھ امپٹن کے نینو فوٹونکس سینٹر سے تعلق رکھنے والے پروفیسر جیریمی باؤمبرگ کا نام اس میدان میں نہایت احترام سے لیا جاتا ہے کیونکہ روشنی کی مختلف اقسام کی مخصوص صفات پر مبنی ٹکنالوجی کے استعمال سے انھوں نے نینوٹکنالوجی کے میدان میں لاتعداد امید افزا گنجائشوں کی نشاندہی اپنی تحقیق کے توسط سے کی ہے۔ پروفیسر باؤمبرگ کی وضع کردہ تکنیک سے مضر حیاتیاتی اجزا اور آلودگی کے عناصر کو دریاؤں کے پانی سے علیحدہ کیا جاسکے گا، مخصوص سالموں کی نشاندہی اور نقل و حمل پر قدغن لگا کر کئی خطرناک مریض کی انفرادی ضروریات کے حساب سے طریقہ علاج وضع کیا جاسکے گا۔

دواؤں کی آزمائش کا نظام

لوگبورو یونیورسٹی، یو.کے. کے سائنس دانوں نے دواؤں کو آزمانے کے لیے ایک ایسا نظام وضع کیا ہے جس کی مدد سے صنعت دواسازی میں نئی دوائیں اور متعلقہ مصنوعات وغیرہ بنانا اب بہت کم وقت میں ممکن ہوسکے گا۔ روشنی کی شعاعوں والے آلات کی مدد سے اب ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں دمے کی نئی دواؤں اور نظام تنفس میں معاون انہیلرس وغیرہ کو ٹیسٹ کیا جاسکے گا۔ حساس آلات والے اس نظام کے وسیلے سے دواؤں کی خوبیوں، خامیوں کے علاوہ دوا کے غبار و بخارات سے متعلق اہم معلومات بھی دواساز کمپنیوں کو حاصل ہوسکیں گی تاکہ دواؤں کو مزید زوداثر بنایا جاسکے۔ دیگر آلات کے ساتھ ساتھ اضافی طور پر اس نظام کا استعمال مصنوعی آلۂ تنفس یا پھر براہ راست مریض کی وساطت سے کیا جاسکتا ہے۔

لوگبورو یونیورسٹی کی ذیلی کمپنی ویری ڈوز کے وضع کردہ اس آزمائشی نظام

میں کئی انقلابی تصورات کو یکجا کیا گیا ہے۔ تحقیقی ٹیم نے سالماتی تجزیے، روشنی کے شعاعی بکھراؤ اور آبی معیار جیسے اصولوں کو بروئے کار لاکر اِنہیلر میں دوا کے غبار کا کئی طریقوں سے تجزیہ کیا۔ انھوں نے اس غبار سے کئی طرح کی سُرخ، نیلی اور زیریں سُرخ شعاعوں کو گزارا اور آلات کی مدد سے شعاعوں کی شدت میں کمی بیشی کا موازنہ کیا۔ سائنس دانوں نے پایا کہ مخصوص دواؤں اور مخصوص مرکبات سے گزرنے والی شعاعوں کی مدد سے اس دوا کی مخصوص شناخت اسی طرح ممکن ہے جیسے کہ کسی فردِ واحد کے دستخط سے ہوتی ہے۔ بعد ازاں کمپیوٹر کی مدد سے دوا کی مخصوص مقدار اور اس کے اثرات کی باریک بیں نشان دہی کی جاتی ہے۔

دوا سازی کی صنعت گذشتہ تقریباً بیس برسوں سے کاسکیڈ امپیکٹرس اور امپنجرس جیسے طریقے استعمال کر رہی تھی جن میں کافی وقت لگتا تھا اور بہت زیادہ محنت بھی درکار ہوتی تھی۔ اس نظام کے موجد پروفیسر پیٹر اسمتھ کو توقع ہے کہ اس نظام کی بدولت نئی دواؤں کی تحقیق و فروغ کے کام میں تیزی آسکے گی۔ لوگبورو یونیورسٹی میں فوٹونکس کے پروفیسر پیٹر اسمتھ نے اپنی ساتھی سائنس داں ڈاکٹر اولگا کسمارتسیوا کے تعاون سے دیری ڈوز کی ایجاد کی ہے۔

سائنسی ترقی نے ہر شعبۂ حیات کو متاثر کیا ہے۔ معدنیات، صنعت و حرفت اور زراعت ہوں یا بجلی کا سامان، کثیر المقاصد منصوبے، ایٹمی توانائی، صحت و ادویات، ماحولیات، دفاعی سامان، ٹیلی فون، موبائل، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، فیکس اور ریموٹ سینسنگ جیسے اہم امور پر سائنسی تحقیق نے مثبت حقائق سے روشناس کرایا جس نے ہماری زندگی کو بیحد فائدہ پہنچایا ہے۔

جدید سائنسی ترقیات نے ہمیں ریموٹ سینسنگ جیسی ٹکنالوجی عطا کی جس سے زمین کے اوپر یا زمین کے اندر چھپے ہوئے قدرت کے خزانے کا پتہ چل جاتا ہے، پانی کے ذخائر کا علم ہو جاتا ہے اور معدنیات کس کس جگہ پائی جاتی ہیں، اس کا علم بغیر زمین کو کھودے ہوئے ہو جاتا ہے۔ ان قدرتی ذخائر کا استعمال کر کے انسانی زندگی کو خوش حال اور آرام دہ بنایا جاتا ہے۔

انسان کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ وہ چاند اور دوسرے سیاروں کو چھو لے سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہوائی جہاز، ہیلی کوپٹر اور دیگر ہوائی مشینوں کے سہارے وہ آسمان کی بلندیوں کو چھوتا رہا ہے مگر دن بہ دن اس کی بڑھتی ہوئی خواہش کہ خلا (Space) میں کیا ہے؟ اور اس کے آگے بھی کیا ہے؟ اس خواہش سے انسانی دماغ نے سٹیلائٹ کو جنم دیا۔ جس کے سہارے وہ چاند اور دوسرے سیاروں کی طرف بڑھنے لگا۔ چاند پر تو اس نے قدم بھی رکھ دیے اور چاند پر پانی کی تلاش بھی کرلی۔ اس طرح انسان اپنی انتھک کاوشوں سے نہ صرف زمین کا ہی فاتح بنا بلکہ خلا اور سیاروں کا بھی فاتح بن گیا۔ اس کی اس فتح میں سائنس کا بہت اہم کردار رہا ہے۔

□□□

پتہ:
46-Nishat Apartments,
(Near Shamshad Market, AMU),
Aligarh (U.P.) 202002

دکنی لغت

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی شعر و ادب کی تفہیم، ہماری ادب فہمی کا ایک اہم پہلو ہے۔ پروفیسر سیّدہ جعفر نے، جو اردو زبان و ادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ دکنیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین و ترتیب میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرہ، تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ طلبہ و اساتذہ کی اسی ضرورت او رسہولت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات — 521، قیمت — 590 روپے

جدید — ہندی اردو لغت (دو جلدوں میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

تکنیک اور ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے "جدید — ہندی اردو لغت" اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم و جدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، مآخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی و مفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ کاوش ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3286 (دونوں جلدیں)، قیمت -/1640 روپے (دونوں جلدیں)

عبیدالرحمٰن

سورج کی طرف بڑھتے قدم

ہندوستان کا خلائی مشن چندریان اسٹیشن دھون خلائی مرکز سے 22اکتوبر 2008 کو چاند کی طرف روانہ ہوا تھا۔ اس کی کارکردگی کی مدت دو سال تھی مگر بعض تکنیکی خرابیوں سے یہ اپنی مدت سے پہلے ہی ختم ہوگیا، لیکن اس نے ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ چاند پر پانی کی موجودگی کے اشارے فراہم کیے جو خلائی تحقیق خصوصاً چاند کے حوالے سے پوری دنیا کے لیے باعث حیرت ومسرت ثابت ہوئے۔ اسی مشن سے حوصلہ پاکر اس کے داغے جانے کے ایک ماہ کے اندر ہی مشن سورج کا پلان ایک بڑے عزم کے ساتھ سامنے آیا۔ اب انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن (ISRO) کے سائنس داں ایک خلائی جہاز کی تعمیر کررہے ہیں جس کا نام، آدتیہ رکھا گیا ہے۔ سنسکرت زبان میں آدتیہ سے مراد سورج ہے۔

آدتیہ کو سوہو یعنی Solar and Heliospheric Observatory کے بعد سب سے زیادہ ترقی یافتہ سٹیلائٹ تسلیم کیا جارہا ہے۔ سوہو کو امریکی خلائی ایجنسی نیشنل ایرونانکس اینڈ اسپیس ایڈمنسٹریشن (NASA) اور یوروپین ایجنسی نے 1995 میں خلا میں نصب کیا تھا۔

آدتیہ 100 کلوگرام کا ایک چھوٹا سٹیلائٹ ہوگا جسے زمینی محور کے 600 کلومیٹر میں نصب کیا جائے گا۔ اس کا اصل مقصد سورج کے سب سے باہری حصے کورونا (Corona) کا مطالعہ ہوگا۔ ISRO کے چیئرمین ڈاکٹر جی مادھون نائر کے مطابق اس اہم سٹیلائٹ سے ہمیں یہ معلوم ہوسکے گا کہ سورج کے اندر کس قسم کے مادّے خارج ہورہے ہیں اور یہ فضا اور کرۂ ہوا پر کس طرح اثر انداز ہوئے ہیں۔ ISRO کے اسپیس سائنس آفس کے ڈپٹی پروگرام ڈائرکٹر جیتی دتا کے مطابق آدتیہ ہندوستانی خلائی سائنس دانوں کے ذریعے بنایا جانے والا اپنی نوعیت کا اوّلین سٹیلائٹ ہوگا جو سورج کے کورونا کی حدت، بڑے پیمانے پر اخراج اور متعلقہ موسمی حالات سے وابستہ رموز کو آشکار کرسکے گا اور یوں ہمیں شمسی عمل کی بابت نہایت اہم معلومات حاصل ہوپائیں گی۔ زمین سے قریبی خلا میں ہمارے جو دیگر سٹیلائٹس مختلف مقاصد کے لیے کام کررہے ہیں، ان کی کارکردگی پر اکثر سورج کے منفی اثرات پڑتے ہیں اور زمین کی مقناطیسی فیلڈ بھی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ اب آدتیہ جیسا سٹیلائٹ ایسی تخریب کاریوں کو روکنے میں معاون ثابت ہوگا۔

شمسی کورونا کا درجۂ حرارت 8لاکھ سے 30لاکھ ڈگری سلسیس کے درمیان رہتا ہے۔ زمین سے اس کورونا کا نظارہ صرف مکمل سورج گرہن کے موقع پر ہی کیا جاسکتا ہے، لہٰذا 2009 کی 29 جولائی کو جو مکمل سورج گرہن واقع ہوا تھا، اس سے حاصل شدہ اعداد وشمار کے مطابق اس سٹیلائٹ کی ڈیزائن میں ضروری ترامیم واضافے کیے گئے ہیں۔ کورونا کے مطالعے کے لیے فضا سے باہر نکل کر تابندہ شمسی قرص کی نقاب کاری کرنا ہوگی، صرف اسی صورت میں یہ مطالعہ شروع کیا جاسکے گا کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کتنا گرم اور اثر آفریں ہے۔ اس سے مستقل برقی ذرات کے ٹکڑے اور انتہائی توانائی کی حامل برق مقناطیسی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں، لہٰذا سورج کے مطالعے کے لیے اس کے انتہائی چمک دار شمسی قرص کی نقاب کاری ضروری ہے۔ اسی کو مدِنظر رکھتے ہوئے آدتیہ کی ڈیزائننگ کی جارہی ہے جس کے لیے ISRO کے علاوہ ہمارے ملک کے دیگر متعلقہ ادارے مصروف کار ہیں۔ آدتیہ کے اسٹڈی گروپ میں ISRO سٹیلائٹ سنٹر کے ذمے داران کے علاوہ ادوے پور سولر آبزرویٹری، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایسٹروفزکس، بنگلور، ریڈیو اسٹرانومی سنٹر، اوٹی، نیشنل سنٹر فار ایسٹروفزکس، پونے اور کئی یونیورسٹیاں شامل ہیں۔ فی الحال اس پروجیکٹ پر 50 کروڑ روپئے کی رقم خرچ ہوگی۔ چونکہ اس میں بہت سے پرزے ISRO خود لگا رہا ہے اور صنعتی معیار کے آلہ جات بھی استعمال کیے جارہے ہیں لہٰذا اخراجات میں کمی آئی ہے۔

آدتیہ Chronograph جیسی سہولت سے لیس ہوگا جس کی مدد سے وہ بڑے پیمانے پر اخراج اور خلائی فضا کے لیے اہم طبعی امور اور کورونا کی مقناطیسی فیلڈ کی ساخت کا مطالعہ کرسکے گا۔ اس کے علاوہ یہ سٹیلائٹ تغیر رفتار اور کورونا کے اندرون میں اس کے تنوع پر بالکل نئی معلومات دے گا۔ ایسی معلومات سے کورونا کی شدید حدّت کے غیر حل شدہ مسئلہ تک رسائی بھی ممکن ہوسکے گی۔

ISRO کا یہ نیا مشن ایک انتہائی شان دار قدم ہے۔ ماضی میں بھی وہ اپنے ایسے ہی پرعزم مشن سے ہندوستان کو سربلندیاں عطا کرتا رہا ہے اور اب سورج کی تسخیر کے حوالے سے ہمارا ملک پوری دنیا میں اپنی مثال آپ ہوگا۔ سورج جیسے ابلتے ہوئے سیارے کی جانب قدم بڑھانے سے قبل چھوٹی سے چھوٹی معلومات بھی بے حد ضروری ہیں اور احتیاطی تدابیر بھی حد درجہ ناگزیر ہیں۔ پلان کے مطابق 2012 میں آدتیہ خلا کی جانب پرواز بھرے گا اور سورج کی بچھائی بساط پر اپنی چالیں چلنا شروع کردے گا اور کورونا کو ہدف مطالعہ بنائے گا۔ اس مخصوص آتشیں حصے میں ایک ملین سے زائد کا درجۂ حرارت موجود ہے۔ اس کے علاوہ شمسی ہوائیں بھی ہیں جو 1000 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی رہتی ہیں۔ ISRO کے ذمے داران کے مطابق انھیں اس سٹیلائٹ کی ضرورت فی الحال دو برسوں کے لیے ہے۔ اس درمیان وہ سورج کے متعلق کافی ضروری معلومات حاصل کرلیں گے۔ اگرچہ یہ مشن گذشتہ کئی برسوں سے

چل رہا تھا مگر چندریان 1 کی کامیاب پرواز اور خلا میں اس کے دیرپا با مقصد قیام نے سائنس دانوں کو نئے عزم سے بھر دیا ہے اور اب اس سمت مزید تیزی سے کام کیا جارہا ہے۔ اس مشن کی کارکردگی کا عرصہ 10 سالوں کا ہوگا۔

سورج نظامِ شمسی کی سب سے بڑی شے ہے۔ اسے G2 اسٹار بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کہکشاں میں بکھرے کھربوں ستاروں میں سے ایک ہے۔ اس کا قطر 1,390,000 کلومیٹر ہے اور کمیت 1.989e30kg ہے جب کہ سطح کا درجۂ حرارت 5,800k اور مرکزی حصے کا 15,600,000k ہے۔ سورج نظامِ شمسی کی کمیت کے کل حصے کا 99.8 فیصد ہے (بقیہ زیادہ تر مشتری کو محیط ہے)۔ سورج میں کمیت کے اعتبار سے 70 فیصد ہائیڈروجن اور 28 فیصد ہیلیم ہے، بقیہ 2 فیصد میں دھات شامل ہیں۔ یہ ہماری زمین کی طرح کوئی سخت چیز نہیں ہے۔ اس کی توانائی تقریباً 386 بیلین بیلین میگاواٹس ہے جو نیوکلیئر انضمام سے پیدا ہوتی ہے۔ اندازہ کیجیے کہ ہر سیکنڈ میں تقریباً 700,000,000 ٹن ہائیڈروجن 695,000,000 ہیلیم میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور 5,000,000 ٹن توانائی شعاعوں کی شکل میں خارج ہوتی رہتی ہے۔ سورج کی سطح کو Photosphere کہا جاتا ہے جس کا درجۂ حرارت 5,800k ہے۔ اس Photosphere کے اوپر ایک چھوٹا سا حصہ Chromosphere موجود ہوتا ہے۔ اسی Chromosphere کے اوپر کورونا واقع ہوتا ہے جو خلا میں کئی میلین کلومیٹر تک دراز ہوتا ہے مگر یہ صرف مکمل سورج گرہن پر ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ کورونا میں درجۂ حرارت 1,000,000k ہوتا ہے۔

چونکہ چاند اسی طرح زمینی مدار میں ہے جس طرح زمین سورج کے، لہٰذا کبھی کبھی چاند زمین اور سورج کے درمیان آجاتا ہے جس سے سورج گرہن وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اگر یہ حرکت پوری طرح درست نہ ہو تو پھر چاند سورج کے قرص کے صرف ایک حصہ کو ہی چھپا پاتا ہے جس کی وجہ سے جزوی گرہن ظاہر ہوتا ہے۔ 2009 کی 22 جولائی کو کامل حرکت کی وجہ سے مکمل سورج گرہن ظاہر ہوا تھا۔ جزوی گرہن زمین کے بڑے حصے میں دیکھا جاسکتا ہے جب کہ مکمل گرہن چند کلومیٹر تک ہی دراز ہوتا ہے۔

حدت اور روشنی کے علاوہ سورج الکٹرون اور پروٹون جیسے کم کثافت والے ذرات کی لکیریں بھی خارج کرتا رہتا ہے۔ اسے شمسی ہوا کہا جاتا ہے جو پورے نظامِ شمسی میں تقریباً 450 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ ان سے زمینی فضا کافی حد تک متاثر ہوتی ہے، زمین کا پاور سسٹم تباہ ہوجاتا ہے، کمیونی کیشن میں رخنہ پیدا ہوتا ہے اور جہاز رانی متاثر ہوتی ہے۔

سورج گرہن سال میں ایک یا دو بار وقوع پذیر ہوتا ہے۔ مکمل سورج گرہن کے تئیں لوگوں میں بڑا جوش دیکھا جاتا ہے۔ 2009 میں ظہور پذیر مکمل سورج گرہن کا مشاہدہ کرنے کے لیے لوگوں نے اس مخصوص جگہ کا سفر اختیار کیا تھا جہاں یہ نظارہ دیکھنے کو ملا۔ اس کے لیے خصوصی طیاروں کی خدمات فراہم کی گئی تھیں۔ چاند کا سایہ دن کے اجالے کو چند لمحات کے لیے اندھیرے میں بدل دیتا ہے۔ تارے بھی چمکنے لگتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جانور اور پرندے اس مخصوص لمحے کو حقیقی رات سمجھ کر اپنی آرام گاہ کی راہ لیتے ہیں۔ شمسی کورونا کے نظارہ کے لیے مکمل سورج گرہن ایک نادر موقع ہوتا ہے۔

ہمارا سورج 4.5 بیلین سالوں سے تابندہ ہے۔ اپنی پیدائش سے اب تک اس نے اپنے مرکز کے ہائیڈروجن ذخیرے کا 50 فیصد استعمال کرلیا ہے۔ آئندہ 5 بیلین سالوں تک یہ بڑے مزے میں اپنی تابانی یوں ہی لٹاتا رہے گا۔ بہرحال، یہاں موضوعِ گفتگو "آدتیہ" سٹیلائٹ ہے جو اس تابندہ سورج کے رازہائے دروں کو دنیا پر منکشف کرے گا۔ بنگلور کا انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایسٹروفزکس ISRO کے مشن سورج کا مرکزی کارگہ ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر ایس چٹرجی نے بتایا ہے کہ اس میں ISRO کا تیار کردہ ایک منی سٹیلائٹ نصب کیا جائے گا جو سورج کے اندر کے اخراج کا مطالعہ کرے گا۔ ایک سولر ٹیلی سکوپ بھی زیرِ تکمیل ہے جو ہمالیہ کی وادی میں نصب کیا جائے گا اور سورج کے مطالعے میں معاون ہوگا۔ اسے لداخ کے گردونواح میں لگایا جائے گا۔ ابھی اس کی بابت کوئی قطعی فیصلہ نہیں لیا گیا ہے۔ اسی انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سراج حسن نے مشن سورج کو زمینی اور شمسی نظام کی ایک مکمل تصویر کشی سے تعبیر کیا ہے ساتھ ہی اسے ستاروں کے مابین رشتوں کی تفہیم کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

سال 2012-18 کے درمیان آدتیہ ہی وہ سب سے زیادہ حساس سٹیلائٹ ہوگا جو سورج جیسے انتہائی پیچیدہ شے کا مطالعہ کرے گا۔ ہمارے ملک کی تقلید میں امریکی خلائی ایجنسی NASA، 2020 میں ایک ایسا ہی سٹیلائٹ داغنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ہمارے ملک کا خلائی تحقیقی ادارہ ISRO آج عالمی سطح پر انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ 1975 کے اپنے اولین سٹیلائٹ کے بعد اب تک اس ادارے نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ قابلِ ستائش ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک کے لیے قابلِ تقلید بھی بن گئے ہیں۔ عظیم ماہرِ فلکیات اور ریاضی داں آریہ بھٹ کے نام منسوب ISRO کے پہلے سٹیلائٹ کے بعد اب جب ہم اس کی کارکردگی پر ایک نگاہِ واپسیں ڈالتے ہیں تو ہمارا سر بجا طور پر فخر سے بلند ہوجاتا ہے۔ اس زمانے میں ISRO اس قابل نہیں تھا کہ اپنا سٹیلائٹ خود داغ سکے۔ آریہ بھٹ اگرچہ ایک ہندوستانی سٹیلائٹ تھا مگر اسے غیر ملک کی مدد سے داغا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ ISRO نے اپنے سٹیلائٹ داغے جانے کی صلاحیت پیدا کرلی اور اب یہ ادارہ نہ صرف اپنے سٹیلائٹس داغ رہا ہے بلکہ اپنے لانچنگ اسٹیشن سری ہری کوٹ، آندھرا پردیش سے دیگر ممالک کے سٹیلائٹس بھی داغ رہا ہے۔ اس درمیان متعدد مقاصد کے تحت مختلف شعبوں سے لیس سٹیلائٹس خلا میں نصب کرنے کے بعد اب قدم سورج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ □□□

پتہ:
555/22, IInd Floor, Zakir Nagar, Jamia Nagar,
New Delhi-110025

سید مجیب الرحمٰن

کیا بیکٹر یا دوست بھی ہوسکتا ہے؟

یہ سننے میں ذرا عجیب سا لگتا ہے کہ ہیڈ ''بیکٹر یا'' بھی اچھا ہوسکتا ہے! مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جسم میں یہ فائدہ مند بیکٹر یا موجود ہیں۔ دوست بیکٹر یا یا پروبائیوٹکس (Probiotic) والی غذا کی خرید وفروخت مغربی ممالک میں بڑے پیانے پر ہورہی ہے۔ لیکن ایشیائی ممالک میں مفید بیکٹر یا والی غذاؤں کا تصور ابھی تک واضح نہیں ہوسکا ہے جبکہ یہ مفید بیکٹر یا نظامِ انہضام کو مستعد اور فعال رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

دوست بیکٹر یا کیا ہیں؟ یوں تو مفید بیکٹر یا نظام انہضام کی فعالیت بڑھاتے ہیں ان کے علاوہ بھی بیکٹر یا کی کچھ اقسام ایسی ہیں جو ان دوست بیکٹر یا کی دشمن ہوتی ہیں اور ہماری آنتوں میں موجود ہیں۔ لیکن آنتوں میں موجود بیکٹر یا کی زیادہ تر اقسام ہاضمے کی اضافی صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہیں۔ بُرے یا نقصان دہ بیکٹر یا، Patho gens سے پھیلنے والے انفیکشنز (Infections) بیشتر مفید بیکٹر یا لڑتے رہتے ہیں جبکہ باقی فائدہ مند دوست بیکٹر یا نظام ہضم کے ساتھ ساتھ منرلز (Minrals) اور پروٹین (Protein) کی پیداواری صلاحیت میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ ایک صحت مند جسم میں عام حالات میں دونوں اقسام کے بیکٹر یا کی تعداد متوازن رہتی ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب ہم متوازن غذا کا استعمال کریں، جبکہ ہوتا یہ ہے کہ غذا کو صرف پیٹ بھرنے کا سامان سمجھا جاتا ہے۔ اس کی غذائیت کے پہلو کو یکسر نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ آرام طلب طرز زندگی اور فاسٹ فوڈز کے بے دریغ استعمال نے جہاں نت نئی بیماریوں کو جنم دیا ہے وہیں جسم میں موجود مفید بیکٹر یا کی پیداوار میں بھی کمی کردی ہے اس کے علاوہ بڑھنے کے قدرتی نظام میں مداخلت، اینٹی بائیوٹکس ادویات پر انحصار، امیون سسٹم میں خلل اور بار بار وائرل بیماریوں کی لپیٹ میں آنا بھی بیکٹر یا کی سطح میں عدم توازن کی وجوہات ہوسکتی ہیں یہ عدم توازن جلدی بیماریوں جیسے اگزیما وغیرہ، نیند، نظام ہاضمہ کی جملہ شکایات یعنی بدہضمی، ناگوار سانس کی بو، گیس بننا، ڈائریا اور قبض کی شکل میں بھی سامنے آسکتا ہے کم عمر بچوں میں دائمی تھکن، اور ان کی نشوونما میں سستی بھی انھی وجوہ میں شامل کی جاسکتی ہیں۔

آپ کیا کرسکتے ہیں؟ طبی طور پر ''پروبائیوٹکس'' انسانی جسم کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ یوروپی ممالک میں وسیع پیانے پر مخصوص گولیاں، کیپسول اور یہاں تک کہ غذاؤں سے بھی اچھے اور برے بیکٹر یا کے درمیان توازن رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اس ضمن میں مختلف تحقیقات کی جاتی رہی ہیں لوگوں کی ایک بڑی تعداد ادویات کی نسبت پروبائیوٹک فوڈ یا ایسی خوراک جس کے استعمال سے مفید اور نقصان دہ بیکٹر یا کی سطح متوازن رہے، استعمال کرنے کو فوقیت دیتی ہے۔ ماہرین اس بارے میں دو گروپ میں بٹ گئے ہیں ایک گروپ ان ادویات او رغذاؤں کے حق میں ہے جبکہ دوسرا گروپ ان کے استعمال کو غلط مانتا ہے۔

پہلا گروپ: پروبائیوٹکس کی حمایت کرنے والے اس گروپ کے حامیوں کا کہنا ہے کہ نام نہاد مفید بیکٹر یا ایک خاص قسم کا پروٹین الفا انٹرفیرون (Alpha-Interferon) پیدا کرتا ہے جو جسم کے امیون سسٹم کی کارکردگی کو فعال بناتا ہے یہ نقصان دہ جراثیموں اور پھپھوند سے لڑتے ہیں۔ دوست بیکٹر یا آنتوں کی دیواروں سے چپکنے والے فاضل مادّوں کے ذرات کو بھی نکال باہر کردیتے ہیں ماہرین غذائیت کے مطابق دہی میں یہ لائیو بیکٹر یا باکثرت موجود ہوتے ہیں انھیں سائنسی اصطلاح میں لیکٹو بیکلی (Lacto Bacilli) کہا جاتا ہے۔

دوسرا گروپ: اس گروہ میں وہ ماہرین شامل ہیں جن کے مطابق اگر ایک پیالی دہی میں سوملین Lacto Bacilli پائے جاتے ہیں تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس سے کہیں زیادہ یعنی بلین سے بھی زیادہ مفید بیکٹر یا انسانی جسم میں مخصوص اعضا میں موجود ہیں یہ گروپ اپنی تحقیقات میں ایسی غذاؤں اور ادویات کا مطالعہ اور ان پر تحقیق بھی کرچکا ہے جن کے لیبل پر پروبائیوٹکس (Pro Biotics) لکھا ہوتا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ان پچاس میں سے تقریباً تین مصنوعات میں لائیو بیکٹر یا نہیں پائے گئے۔

برطانوی ڈاکٹر سائمن، میولیکولر مائیکروبائیلوجی کے ماہر ہیں اور اسکول آف بائیولوجیکل، سائنس (School of Biological Science) رائیل ہولوے یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں وہ اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ وہ وقت آگیا ہے جب ہمیں پروبائیوٹکس کی حقیقت تسلیم کرلینی چاہیے۔

مفید بیکٹر یا کیا کرتے ہیں؟ لیکٹک ایسڈ بیکٹر یا، (Lactic Acid

(Bacteria) مفید بیکٹریا کی سب سے اہم قسم ہے جس میں شکر، لیکٹوس کے ساتھ دیگر کاربوہائیڈریٹس کو لیکٹک ایسڈ میں تبدیل کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

لیکٹوس انٹولرینس (Lacto Intorance)(دودھ کا ہضم نہ ہونا): اسلیکٹک ایسڈ (Aslactic Acid) بیکٹریا لیکٹوس کو لیکٹک ایسڈ میں بدل کر معدہ کی فعالیت بڑھاتے ہیں۔ لیکٹوس انٹولرینس (Lactos Intorance) آنتوں کی ایک ایسی بیماری ہے جو ہر تیسرے شخص کو ہوسکتی ہے اس میں بیماری میں سادہ شکر کو لیکٹوس میں تبدیل کرنے کی صلاحیت کم ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے یہ شکر آنتوں ہی میں رہ جاتی ہے اور تیزابیت کا عمل شروع ہوجاتا ہے یہ بھی یاد رکھیے کہ پروبائیوٹکس لیکٹوس کی اضافی صلاحیت میں، دہی میں پائے جانے والے بیکٹریا سے کم اثر پذیر ہوتے ہیں۔

کولون یا آنت کا سرطان: جانوروں پر کیے جانے والے کچھ مشاہدات میں یہ ثابت ہوا ہے کہ لیکٹک ایسڈ بیکٹریا میں جنیاتی تبدیلی پیدا کرنے کی قابلیت ہے جو Helerocyclic Animes (سرطان کا سبب بننے والا ایک مادہ، جو پکے ہوئے گوشت میں پایا جاتا ہے) کو جسم میں پھیلنے سے روکتی ہے یہ آنت کا سرطان بننے کے امکانات بھی زائل کرتا ہے۔

کولیسٹرول (Colestrole): پروبائیوٹکس یا مفید بیکٹریا میں کولیسٹرول کی سطح کو کم کرنے کی اثر پذیری بھی موجود ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ صفرا جب آنت میں پھیلتا ہے تو اسے دوبارہ جذب ہونے سے یہی مفید بیکٹریا روکتے ہیں کیونکہ اس طرح یہ خون میں کولیسٹرول کی شکل میں داخل ہوسکتا ہے۔

بلڈ پریشر (Blood Pressure): بلند فشار خون میں مبتلا افراد کے لیے بھی پروبائیوٹکس والی ادویات اور غذائیں مفید ہیں ان مفید بیکٹریا میں دوران خون کو نارمل سطح پر رکھنے کی خصوصیت بھی موجود ہے۔

امیون سسٹم اور انفیکشن (Immune System or Infection): دوست بیکٹریا جسم کے مامونیت کے نظام یا امیون سسٹم پر مثبت اثر انداز ہوتے ہیں نیز مرض آور بیکٹریا کی روک تھام بھی کرتے ہیں۔

ایک قسم کے پلازمہ خلیات جو امیون سسٹم کو فعال کرتے ہیں ان کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے کچھ مشاہدات سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ پروبائیوٹکس سانس کی نالی کے انفیکشن کے امکانات کو بھی زائل کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں جبکہ بچوں میں منہ خصوصاً دانتوں کی بیماریوں سے لڑنے کے لیے قوت مدافعت بڑھاتے ہیں۔ روناوائرس (Rona Virus) سے ہونے والا ڈائریا (بچوں اور مسافروں میں) کی شدت کو کم کرنے کے لیے پروبائیوٹکس سے بھرپور غذائیں اور ادویات استعمال کروائی جاتی ہیں۔

معدہ کی جلن اور تیزابیت: لیکٹک ایسڈ بیکٹریا، (Lactic Acid Bacteria)، انٹی بائیوٹکس (Anti Biotic) ادویات سے ہونے والے معدہ کی انفیکشن (Helicobacter Pylori) کو ختم کرنے کے لیے بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اینٹی بائیوٹکس سے ہونے والا ڈائریا: 2007 میں یونیورسٹی آف مونٹریال کی فارماکولوجسٹ نے ریسرچ کے ذریعے اس قیاس کی تصدیق کی ہے کہ مفید بیکٹریا لیکٹوہیکلی (Lacto Hacly) والے مرکب سے اینٹی بائیوٹکس سے ہونے والے ڈائریا کو قابو کیا جاسکتا ہے۔ آنتوں میں غیر صحت مند بیکٹریا کے ضرر رساں نقصان کا ازالہ بھی یہ ہی بیکٹریا کرتے ہیں۔

حساسیت کا خاتمہ: معدہ کے جملہ مسائل کے علاوہ مخصوص غذائی اجزا سے ہونے والی حساسیت کسی حد تک مفید بیکٹریا کم کرسکتا ہے۔ جلد کی حساسیت اور ایگزیما سے متعلق مسائل میں ان کی کارکردگی البتہ سست پڑ جاتی ہے۔

قدرتی معدنیات جذب کرنے کی صلاحیت: اناج، میوہ جات، اور پھلوں میں شامل ایک جز Phytate لیکٹو بیسلی بیکٹریا کو فعال کرتا ہے اور یوں معدنیات بآسانی جسم کا حصہ بننے لگتے ہیں۔

بیکٹریا میں توازن: نظام قدرت ہے کہ دنیا میں خوردبینی اجسام کی تعداد لامحدود ہے۔ اچھے اور برے بیکٹریا بھی اسی صف میں آتے ہیں۔ انسانی اجسام میں خاص طور پر جلد کی تہوں اور آنتوں میں بیکٹریا کی کثیر تعداد موجود ہوتی ہے۔ نومولود بچوں میں پیدائش کے بعد ہی یہ اپنی آماجگاہ بنالیتے ہیں۔ امیون سسٹم کی باقاعدہ نشوونما کے لیے بیکٹریا زندگی کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ اس کی قوت مدافعت میں اضافے کے ساتھ غذا کو ہضم ہونے اور اس کی غذائیت کو جذب کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ انسانی جسموں میں خرد جرثوموں کی موجودگی نہایت ضروری ہے۔ اچھی صحت اور خوشگوار زندگی کے لیے اچھے اور برے بیکٹریا کی متوازن مقدار بہرحال اہم کردار ادا کرتی ہے۔

کسی بیماری کے نتیجے میں جب اینٹی بائیوٹکس ادویات کھائی جاتی ہیں تو یہ ادویات آنتوں میں موجود برے بیکٹریا کے ساتھ اچھے بیکٹریا کا بھی خاتمہ کردیتی ہیں۔ بیشتر معالج ان ادویات کے ساتھ پروبائیوٹکس سے بھرپور خوراک یا ادویات کا استعمال بھی تجویز کرتے ہیں۔ یہ غیر متوازن صورتحال آنتوں، معدہ میں گیس، جلن، اپھارہ اور ڈائریا کا سبب بن سکتی ہے۔

برے خرد جرثومے جیسے بیماری پھیلانے والے بیکٹریا، پھپھوند اور طفیلی بیکٹریا بھی بیکٹریا کی سطح کو غیر متوازن کرتے ہیں۔ ماہرین غذائیت نے برے

بیکٹر یا کی سطح بڑھ جانے کی نشاندہی مندرجہ ذیل نکات میں کی ہے۔ دوران سفر ہونے والا ڈائریا، آنتوں یا معدہ کی جملہ بیماریاں، السر، خواتین کے اعضا مخصوصہ کے انفیکشن، دانتوں اور مسوڑھوں کے انفیکشن، سانس کی بیماریاں، جلدی امراض۔

پروبائیوٹکس پر کی جانے والی تحقیقات: مفید بیکٹر یا سے متعلق اب تک کی جانے والی مختلف تحقیقات میں ان کی موجودگی، افادیت اور مقدار کے بارے میں اب تک مثبت نتائج سامنے نہیں آسکے ہیں۔ امیون سسٹم کو نظام ہاضمہ سے جوڑنے والے کچھ خلیات کی نشاندہی ہو چکی ہے اسی ضمن میں ایک نظریہ یہ بھی دیا جاتا ہے کہ آنت میں موجود خرد جرثوموں کی ہیئت اگر تبدیل کردی جائے یا انھیں پروبائیوٹکس کا نام دے دیا جائے تو وہ انسانی امیون سسٹم کو متاثر کر سکتے ہیں۔

آنتوں اور ان میں پائے جانے والے بیکٹر یا کی دریافت اور ان سے متعلق شبہات دور کرنے کے لیے جدید ٹیکنالوجی سے بھی مدد لی جارہی ہے۔ ان کی کوالٹی جیسے اگر پروبائیوٹکس کو غذائی اجزا میں شامل کیا جائے تو کیا ہوگا؟ ان کی بڑھنے اور شفائی خصوصیات کو تبدیل کیا جائے تو نتائج کیا ہوں گے؟ یہ تمام نکات بھی مدِ نظر رکھے جا رہے ہیں۔ اگر پروبائیوٹکس کے کوئی ضرر رساں اثرات ہیں تو انھیں کم سے کم کرنے اور ان کے فوائد کارکردگی پر دیرپا زندگی کے لیے کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔

پروبائیوٹکس یا دوست بیکٹر یا پر ہونے والی تحقیقات ابھی محدود سطح تک ہیں یہ ایک نہایت اہم دریافت ہے مگر اس ضمن میں مزید مشاہدات وشواہد کی ضرورت ہے مفید بیکٹر یا سے ہونے والے ردِ عمل سے بچاتے ہیں۔ عام لوگوں میں ان مفید بیکٹر یا کی افادیت کا علم پھیلانے کی کی اشد ضرورت ہے تاہم اسے اب تک نظر انداز کیا جارہا ہے۔ ☐☐☐

پتہ:
550, Churiwalan, Delhi-110006

بہادری کے کارنامے

مصنف: منوج داس/ مترجم: ایس. ایم. احمد

ہمارے ملک کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے لاتعداد قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ جن سورماؤں نے اپنی جان آزادیِ وطن کے لیے نچھاور کی، ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں جدوجہدِ آزادی کے ابتدائی دور کے ایسے ہی بہادر سپوتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/25 روپے

منتخب التواریخ (جلد اوّل، دوم وسوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی/ مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورّخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاثمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے ''اکبر نامہ'' کے ساتھ ساتھ ملا عبدالقادر کی ''منتخب التواریخ'' (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملا عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند و ناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو ''اکبر نامہ'' سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم وسوم 620، قیمت: جلد اوّل -/335 روپے / جلد دوم وسوم 555 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ اداره

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

خواجہ عبدالمنتقم (ہماری مطبوعات سے)

انسانی حقوق اور قانون کی بالادستی

حکمرانی قانون، اقتدار قانون، برتری قانون یا قانون کی بالادستی (Rule of Law) ایک ایسی اصطلاح ہے جو عملاً قانون کی بلااعتراض برتری کی جانب اشارہ کرتی ہے اور معاملات کی ایسی صورت حال کو پیش کرتی ہے جس میں ہر شخص قانون کا احترام کرتا ہے اور جہاں قانون کی پیروی انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر شخص پر لازم ہے خواہ وہ شہری ہو یا حکومت۔ لکشمی نرائن گپتا بنام کلکٹر ضلع شیوپور والے معاملے میں بھی ایسا ہی اظہار کیا گیا تھا۔ قانون کی بالادستی کا نظریہ ہمارے جدید قانونی نظام کی دین ہے اور یہ آج کی ترقی یافتہ اور متمدن دنیا کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے۔

قانون کی بالادستی کی اصطلاح جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، قانون کی برتری کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ یہ اصطلاح ایک فرانسیسی اصول La Principe de Legalite سے ماخوذ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکار کی جو بھی کارروائی ہو، اس کا کوئی نہ کوئی قانونی جواز ہونا چاہیے۔ سرکار اپنی من مانی نہیں کرسکتی۔ اس اصول کا اطلاق ہر قانونی نظام اور ہر حکومت میں تب تک ہوتا ہے جب تک وہ حکومت قانون کی پابند ہو۔

EDWARD COKE کو اقتدار قانون کا بانی کہا جاتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ بادشاہ یعنی حکمراں کو کسی شخص کے تحت نہ ہو کر خدا اور قانون کے تحت ہونا چاہیے۔ اس نظریے میں بتدریج تبدیلیاں آتی رہیں اور 1885 میں A.V.DICEY نے اس نظریے کو ایک نئی شکل دی۔ ان کا کہنا تھا کہ برطانوی آئین کی بنیاد اقتدار قانون ہے اور اس کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں:

الف: قانون کی برتری، حکام و سرکار کو من مانے ڈھنگ سے کام کرنے کی اجازت نہ دینا۔

ب: کوئی بھی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ حاکم اور محکوم یعنی ہر شخص پر ایک ہی قانون لاگو ہوتا ہے اور ان سب کو یکساں قانونی تحفظ عطا کیا گیا ہے۔

ج: عدالتوں کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ قانون کی برتری کو قائم رکھیں۔

قانونی ماہرین کے بین الاقوامی کمیشن نے اپنی ذیلی قرارداد میں قانون کی بالادستی کو تین درجوں میں بانٹا تھا۔ لیکن اس میں اب ایک چوتھے درجے کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔

1. قانون ساز ادارے اور قانون کی بالادستی
2. انتظامیہ اور قانون کی بالادستی
3. عدلیہ اور قانون کی بالادستی
4. فوجداری کارروائی اور قانون کی بالادستی

1. قانون ساز ادارے اور قانون کی بالادستی:

قانون ساز اداروں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسا قانون بنائیں جس سے تمام انسانوں کو ایک باوقار حیثیت حاصل ہو اور انھیں تمام شہری، سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی اور ثقافتی حقوق حاصل ہوں۔ کسی بھی شخص کے ساتھ مذہب، نسل، ذات، جنس، نسب، بودوباش یا کسی اور بنا پر کوئی امتیاز نہ برتا جائے اور انسانوں کے بیچ خواہ ان کا تعلق اقلیت سے ہو یا اکثریت سے یا دیگر کسی طبقے سے کوئی تفریق نہ کی جائے۔ شہریوں کی مذہبی آزادی، ان کے مذہبی عقائد اور مذہبی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہ کی جائے۔ کوئی ایسا کام یا کارروائی نہ کی جائے اور اگر کی جارہی ہو تو اسے روکا جائے جس سے کسی بھی شخص کے بنیادی حقوق اور آزادی پر منفی اثر پڑے۔

2. انتظامیہ اور قانون کے بالادستی:

ایک مہذب معاشرے میں انتظامیہ مناسب تحفظ اور عدالتی نظرثانی کے تحت ہونی چاہیے تاکہ اس کے ذریعے کی جانے والی تمام کارروائیوں پر نظر رکھی جاسکے۔ انتظامیہ کا یہ فرض ہے کہ وہ نظم و نسق قائم رکھے اور وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ معاشرے کو مناسب سماجی اور معاشی حالات میسر ہوں۔ اس کے علاوہ انتظامیہ کے پاس ایسی طاقت اور وسائل بھی ہوں جن سے وہ اپنا کام بخوبی انجام دے سکے۔ اس کے علاوہ انتظامیہ کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ کسی شخص کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے پہلے اسے اس بات کا موقع دے کہ وہ اپنی دفاع کرسکے۔ بالفاظ دیگر اسے سنوائی کا پورا پورا موقع ملنا چاہیے تاکہ اسے یہ احساس نہ ہو کہ اس کی بات سنی ہی نہیں گئی اور اسے صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں ملا۔ audi alteram Partem (Hear the other side)

''انسانی حقوق'' سے ماخوذ، مصنف: خواجہ عبدالمنتقم، صفحات. 497، قیمت : -/430

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

کے اصول کا تقاضا بھی یہی ہے۔

3. عدلیہ اور قانون کی بالادستی:

ہر مہذب معاشرے کا تقاضا ہے کہ وہاں عدلیہ کو مکمل آزادی حاصل ہو اور انتظامیہ و قانون ساز اداروں کو اس بات کی اجازت نہ ہو کہ وہ عدالت کے کام کاج میں دخل اندازی کر سکیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جج اپنے من مانے ڈھنگ سے کام کریں اور دراصل ایسا ہوتا بھی نہیں ہے۔ جج بھی قانونی حدود کے اندر رہ کر ہی اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔

قانون کی بالادستی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ قانونی پیشے کی شکل، ایک منظم پیشے کی ہونی چاہیے اور وہ پیشہ اختیار کرنے والے لوگوں کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ اپنے معاملات کا انتظام آزادانہ طور پر کر سکیں۔ قانون کی بالادستی پر مکمل عمل درآمدگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ سماج کے ہر طبقے، غریب یا امیر کی عدالت تک پہنچ ہونی چاہیے اور اسے ہر فورم میں چارہ جوئی کرنے کا نہ صرف حق ہونا چاہیے بلکہ اس میں ایسا کرنے کی سکت بھی ہونی چاہیے۔

اب سے تقریباً چالیس سال قبل ہمارے قانون کمیشن نے 1961 میں اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ کوئی قوم جمہوری ڈھنگ سے تب تک نہیں چل سکتی جب تک کہ اسے قانون کی بالادستی اور اس کی اہمیت کا مکمل احساس نہ ہو۔

قانون کی بالادستی کی جھلک ہمارے آئین کی تمہید، بنیادی حقوق، ہدایتی اصولوں اور دیگر توضیعات میں بالکل صاف صاف نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر آئین کی دفعات 14 تا 18، 19 تا 28، 29، 30، 32، 37 تا 47 و 50 کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

ان توضیعات کا باب ''انسانی حقوق اور بھارت کا آئین' و باب ''انسانی حقوق' بھارت کا آئین اور اقلیتیں میں تفصیلی طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں اقتدار قانون اور عدالتی رجحان، عنوان کے تحت بھی اس موضوع پر مزید بحث کی گئی ہے۔

4. فوجداری کارروائی اور قانون کی بالادستی:

فوجداری کارروائی میں قانون کی بالادستی سے مراد یہ ہے کہ فوجداری قانون مکمل طور پر معین ہونا چاہیے۔ ملزموں کی بابت، جب تک انھیں عدالت مجرم قرار نہ دے دے، یہ قیاس کیا جانا چاہیے کہ وہ بے گناہ ہیں۔ ملزموں کو سنوائی اور دفاع کا پورا پورا موقع دیا جانا چاہیے۔ انھیں سنوائی کا نوٹس دیا جانا چاہیے، قانونی مشیر کی امداد فراہم کی جانی چاہیے۔ انھیں گواہ پیش کرنے اور مخالف شہادت کی تردید کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ کسی شخص کو اس بات کے لیے مجبور نہیں کیا جانا چاہیے کہ وہ خود پر کوئی الزام لگائے۔ کسی بھی ملزم پر کوئی جسمانی یا نفسیاتی دباؤ نہیں ہونا چاہیے۔ فوجداری کارروائی جب قانون میں دیگر توضیعات نہ ہوں تب تک کھلی عدالت میں کی جانی چاہیے۔ اگر کسی شخص کو مجرم قرار دے دیا گیا ہے یا اسے رہا کر دیا گیا ہے تو اس کے خلاف دوبارہ کارروائی نہیں کی جانی چاہیے۔ (DOUBLE JEOPARDY) کی اجازت نہیں ہے فریق متعلق کو قانونی چارہ جوئی کے لیے جس میں اپیل کرنا بھی شامل ہے، مناسب فورم میسر ہونے چاہئیں۔ کم سے کم اوپر کی ایک عدالت میں اپیل کا حق تو ہونا ہی چاہیے۔

قانون کی بالادستی اور عدالتی رجحان:

ہندوستانی عدلیہ نے قانون کی بالادستی کو بھارت کے آئین کے بنیادی ڈھانچے کا ایک حصہ مانا ہے اور سپریم کورٹ کے گذشتہ لگ بھگ 25 برسوں میں کیے گئے فیصلوں نے اس اصول کو جلا بخشی ہے۔ اندرا گاندھی نہرو بنام راج نرائن والے معاملے میں آئین کی انتالیسویں ترمیم کے ذریعے آئین میں جو دفعہ 329۔الف (4) و (5) شامل کی گئی تھی اس کے قانونی جواز پر غور کیا گیا تھا۔ ان توضیعات کے تحت وزیراعظم اور لوک سبھا کے اسپیکر کے انتخاب کو صرف ایسے حاکم کے روبرو چیلنج کیا جا سکتا تھا جس کے بارے میں پارلیمنٹ نے اس مقصد کے لیے توضیع کی ہو۔ سپریم کورٹ نے اس معاملے میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ ان دفعات کو آئین میں شامل کرنے کا کوئی قانونی جواز نہیں تھا اور یہ دفعات غیر آئینی ہیں۔ اس کے علاوہ سپریم کورٹ نے یہ بھی کہا تھا کہ اس سے دفعہ 14 کی جس میں واضح طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ مملکت کسی شخص کو بھارت کے علاقے میں قانون کی نظر میں مساوات یا قوانین کے مساویانہ تحفظ سے محروم نہیں کرے گی، نفی ہوتی ہے۔ عدالت نے اس رائے کا بھی اظہار کیا تھا کہ یہ توضیعات من مانے ڈھنگ سے آئین میں شامل کی گئی ہیں اور ان کا مقصد اقتدار قانون کو نقصان پہنچانا ہے۔

بچن سنگھ بنام ریاست پنجاب والے معاملے میں سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ قانون کی بالادستی میں من مانے ڈھنگ سے کام کرنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اور جہاں پر بھی یہ محسوس ہو کہ کوئی کام من مانے ڈھنگ سے کیا گیا ہے یا ایسا کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے تو اسے قانون کی بالادستی کی نفی سمجھا جائے گا۔

ڈی ٹی سی بنام دلی ٹرانسپورٹ مزدور کانگریس والے معاملے میں دلی روڈ ٹرانسپورٹ اتھارٹی (تقرری اور ملازمت کی شرطیں) ضوابط، 1952 کے ضابطے (9) ب، جس میں اتھارٹی کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنے کسی بھی مستقل ملازم کو بغیر نوٹس دیے یا نوٹس کی جگہ بغیر تنخواہ دیے ملازمت سے برطرف کر سکتی ہے، یہ فیصلہ دیا گیا تھا کہ یہ ضابطہ غیر قانونی، باطل اور بے اثر ہے۔ سپریم کورٹ نے اس معاملے میں یہ بھی کہا تھا کہ کوئی بھی ایسا فیصلہ جو

مسلمہ اصولوں اور قاعدوں کے خلاف ہو وہ غیر قانونی ہے اور اس سے قانون کی بالادستی کے اصول کی نفی ہوتی ہے۔ اسی طرح مینکا گاندھی بنام یونین آف انڈیا والے معاملے میں بھی سپریم کورٹ نے اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا تھا اور قانون کی بالادستی کے اصول پر سختی سے عمل درآمدگی کی بات کہی تھی۔

متذکرہ بالا تمام نظریوں سے اور اس سے قبل کیے گئے قانون کی بالادستی کی اصطلاح کے تجزیہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کسی بھی جمہوری ملک میں یا ایسے کسی بھی دیگر ملک میں جہاں قانون کا احترام کیا جاتا ہو، قانون کی بالادستی کے اصول کے مطابق چلنا اشد ضروری ہے۔

قانون سب سے بالاتر ہے اور اس کی برتری کو قائم رکھنا ہر معاشرے کے مفاد میں ہے۔ ہمارے آئین کو وضع کرتے وقت اس بات کا پورا پورا دھیان رکھا گیا تھا اور ہمارا آئین اس کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے اگر قانون ساز اداروں یا انتظامیہ سے کوئی لغزش ہوئی ہے تو عدلیہ نے اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے مناسب اقدام کیے ہیں۔ دوسری طرف قانون ساز اداروں اور انتظامیہ نے سپریم کورٹ کی ہدایتوں اور احکام کی عمل درآمدگی کے لیے مناسب اقدام کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کے آئین میں اب تک 94 ترامیم ہوچکی ہیں۔ ایسا وقت کی ضرورت، وقت کے تقاضوں، بدلتے ہوئے سماجی، معاشی اور قانونی حالات و بین الاقوامی تبدیلیوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کے آئین کو ایک لچکدار آئین کہا جاتا ہے۔ ان بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر موجودہ حکومت نے آئین کی نظر ثانی کرنے کے لیے کمیشن قائم کیا تھا جس نے اپنی رپورٹ موجودہ حکومت کے روبرو بغرض غور و مزید کارروائی پیش کردی ہے۔

□□□

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپئے مجلد، 336 روپئے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: عمل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپئے مجلد، 410 روپئے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہوگیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جاسکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ای.اے.جی.رابنسن

(ہماری مطبوعات سے)

اجارہ داری کیا ہے؟

انیسویں صدی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آزاد مسابقت کا زمانہ تھا اور بیسویں صدی اجارہ داروں کا دور ہے۔ اس بات کی یک گونہ شہادت سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو۔ گذشتہ صدی کے آخری پچیس سال کے دوران پرانے حالات میں نئی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ حالات میں تبدیلی کا یہ رجحان بعض ممالک میں زیادہ نمایاں تھا اور بعض میں کم۔ طاقت ور نیم اجارہ دارانہ کاروبار سے ہم اب اچھی طرح مانوس ہوگئے ہیں۔ لیکن اس کی ابتدا گذشتہ صدی کے اواخر میں امریکہ اور جرمنی سے ہوئی۔ انگلستان میں بھی یہ رجحان پیدا ہوگیا تھا مگر جرمنی اور امریکہ کے مقابلے میں انگلستان اس باب میں پیچھے تھا۔ لفظ اجارہ کا استعمال جب ہم مندرجہ بالا طریقے پر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اس کا مفہوم صاف ہوتا ہے۔ لیکن جب اجارہ دار کے طرزِ عمل سے متعلق دقیق بحثیں کرنی پڑیں تو پھر یہ بات ضروری ہوجاتی ہے کہ ہم اجارہ دار کی کوئی قطعی تعریف متعین کرلیں۔

چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجارہ کیا ہے اور اجارہ دار کون ہوتا ہے؟ اجارہ دار کے بارے میں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اجارہ دار وہ ہے جو کسی جنس (Commodity) کا تنہا بیچنے والا ہو۔ لیکن اس تعریف نے ہم کو ایک مشکل سے نکال کر دوری مشکل میں ڈال دیا۔ جنس سے کیا مراد ہے جنس کی کوئی پکی اور آسان تعریف نہ ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ موٹر، وائرلیس یا چاکلیٹ کے کارخانوں کی پیداواریں ایسی نہیں ہوتیں کہ جن کو آسانی سے جنس قرار دیا جاسکے۔ موٹر کے کارخانوں میں چھوٹی بڑی موٹریں بنتی ہیں جن میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا ان کو ایک جنس نہیں قرار دیا جاسکتا۔

جب دو ماہی گیر جہاز والے ایک ہی قسم کی مچھلیاں پکڑ کر ساحل پر فروخت کرنے لاتے ہیں تو دونوں جہازوں کی پکڑی ہوئی مچھلیاں ایک ہی جنس قرار پاتی ہیں، خریدار کی نظر میں دونوں جہازوں کی مچھلی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک جہاز والا اگر اپنی مچھلی کی قیمت میں ذرا سا بھی اضافہ کرے گا تو لوگ اس کی مچھلی کی بجائے اس جہاز والے کی مچھلی پر ٹوٹ پڑیں گے، جس نے اپنی مچھلی کی قیمت مروجہ بازاری قیمت سے بڑھنے نہیں دی ہے لیکن حقیقی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ ہر تاجر گویا ایک الگ ہی جنس کا فروشندہ ہوتا ہے۔ ایک تاجر کا مال دوسرے تاجر کے مال کا حقیقی بدل بہت کم ہوتا ہے۔ ہر چند کہ دونوں تاجر اپنے مال کے لیے لفظ ایک ہی استعمال کرتے ہوں مثلاً غلّے کا بیوپاری، کپڑے کا تاجر یا مچھلی کا بیچنے والا۔ لیکن غلّے غلّے میں فرق ہوتا ہے۔ نام کی یکسانیت کے باوجود جنس ایک نہیں ہوتی لہٰذا قیمتوں میں بھی فرق ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات اجناس میں یہ فرق حقیقی ہوتے ہیں اور بعض اوقات محض خریداروں کے ذہن کی پیداوار ہوتے ہیں کہ فلاں حلوائی کی مٹھائی دوسروں کے مقابلے میں اچھی ہے، یا فلاں باغ کا آم دوسرے باغ کے مقابلے میں بہتر ہوتا ہے لہٰذا جس باغ کی شہرت اچھی ہے اس باغ کا مالک اپنے باغ کے آم کی قیمت کچھ بڑھ کر بھی مانگے تو خریدار دینے پر تیار ہوجائیں گے۔ ماہی گیر جہازوں کی مندرجہ بالا مثال میں دونوں جہازوں کی پیداوار کو بالکل ہم جنس مانا گیا ہے، لہٰذا ان میں سے ہر ایک جہاز کی پکڑی ہوئی مچھلیوں کی طلب کی لچک لامحدود ہوگی یعنی ایک جہاز والی مچھلی کی قیمت میں ذرا بھی تغیر ہو تو طلب میں بہت زیادہ تغیر ہوجائے گا۔ اگر قیمت ذرا چڑھے تو بکری بالکل صفر ہوکر رہ جائے گی اس لیے کہ خریدار دوسرے جہاز والی مچھلی پر ٹوٹ پڑیں گے جس کی قیمت نہیں بڑھی ہوگی۔ جب صورت حال یہ ہو تو معاشی زبان میں کہا جاتا ہے مسابقت مکمل ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر حالات میں قیمتوں میں تھوڑے بہت اتار چڑھاؤ کا طلب پر اتنا زیادہ اثر نہیں پڑتا کہ طلب کی لچک کو لامحدود کہا جاسکے جیسا کہ مچھلیوں کی مندرجہ بالا مثال میں ہے جب طلب کی لچک لامحدود نہ ہو تو ہم کہتے ہیں کہ ''نامکمل مسابقت'' کی صورت ہے۔

مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں اب ہم اگر اجارہ داری کی ایک قطعی تعریف پیش کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر تاجر اپنے مال کا اجارہ دار یا تنہا بیچنے والا ہے (مثلاً لپٹن چائے کی اجارہ دار لپٹن کمپنی ہے، بروک بانڈ چائے کی اجارہ دار بروک بانڈ کمپنی ہے یا ڈالڈا وناسپتی تیل کے اجارہ دار ڈالڈا بنانے والے ہیں اور رتھ وناسپتی تیل کے اجارہ دار رتھ وناسپتی بنانے والے ہیں) لہٰذا مسئلہ یہ معلوم کرنا نہیں ہے کہ اجارہ کے مندرجہ بالا مفہوم میں کون اجارہ دار ہے

''اجارہ''سے ماخوذ، مصنف: ای.اے.جی.رابنسن، صفحات. 351، قیمت: -/17-50

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

اور کون اجارہ دار نہیں ہے، اہم مسئلہ یہ ہے کہ کن حالات کے تحت اجارہ دار بحیثیت اجارہ دار کے مضبوط پوزیشن میں ہوتا ہے اور کن حالات کے تحت اس کی پوزیشن کمزور ہوجاتی ہے۔ اجارہ دار کی پوزیشن کی مضبوطی اس بات میں ہے کہ اگر اجارہ دار اپنے مال کا دام بڑھا بھی دے تو خریدار اس کے مال کی خریداری ترک نہ کردیں۔ خریداروں کو برگشتہ کیے بغیر قیمتوں میں کس حد تک ایک اجارہ دار اضافہ کرسکتا ہے اس کا انحصار متعلقہ شے کی طلب کی لچک پر ہے اور کسی شے کی طلب کی لچک اس پر منحصر ہے کہ اس شے کے بدل کے طور پر استعمال میں آنے والی کون کون سی دوسری اشیا بازار میں مل رہی ہیں (مثلاً لپٹن چائے کے بدلے بروک بانڈ چائے، کالٹیکس پٹرول کے بدلے برماشیل کا پٹرول، یا چائے کے بدلے کافی، کافی کے بدلے کوکو وغیرہ وغیرہ۔) لفظ بدل کو اگر ہم وسیع ترین مفہوم میں استعمال کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ہر شے جو ہم خریدتے ہیں اس کا کوئی نہ کوئی بدل ضرور موجود ہے۔ لہٰذا اگر ہماری پسندیدہ چیز یا برانڈ کی قیمت ایک خاص حد سے بڑھ جائے تو ہم دوسری چیز یا برانڈ کو خریدنے پر مائل ہوجائیں گے۔ قیمتوں میں کس حد تک اضافے کو نظرانداز کرتے ہوئے ہم اپنی پرانی پسندیدہ شے یا برانڈ کی خریداری رکھیں گے اس کا انحصار ہماری پرانی عادتوں اور اس بارے میں لوگوں کی عام روش پر ہے۔

قیمتوں میں اس طرح نسبتاً خفیف اضافے کا ردِعمل تمام افراد پر یکساں نہیں ہوگا۔ بعض لوگ قیمت میں اضافہ ہوتے ہی کسی شئے بدل کی جانب مائل ہوجائیں گے۔ بعض دوسرے حضرات ممکن ہے خفیف اضافۂ قیمت کو نظرانداز کرتے ہوئے کچھ دیر وضع داری نبھانے کی کوشش کریں۔ زیادہ دولت مند لوگ تھوڑے بہت اضافۂ قیمت کو ممکن ہے خاطر ہی میں نہ لائیں اور خریداری جاری رکھیں۔ لیکن دیر یا سویر ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب کہ کسی شے کی قیمتوں میں مزید اضافے کو کوئی بھی نظرانداز نہیں کرسکتا اور دوسری اشیائے بدل کی طرف اس کو متوجہ ہونا پڑتا ہے۔

ظاہر ہے بعض اشیا ایسی ہیں جن کا قریبی بدل پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر ان اشیا کی قیمت میں ذرا اضافہ ہوتو ہم کو اس بات کی زیادہ ترغیب ہوگی کہ اس کی خریداری چھوڑ کر دوسری شے (جو اس کا قریبی بدل ہے) کی خریداری پر اپنا پیسہ خرچ کریں۔ یعنی بعض چیزیں بہ آسانی ایک دوسرے کے بدلے استعمال کی جاسکتی ہیں۔ بعض چیزیں ایک دوسرے کا اس قدر قریبی بدل ہوسکتی ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کی قیمت میں ذرا سا بھی اضافہ ہوتو ہم دوسری بدل والی شے کے خریدنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ مثلاً مارس نمبر 8 (Moris 8 eight) گاڑی اور آسٹین نمبر 8 (Austen eight) یا پائی ریڈیو اور مرفی ریڈیو آپس میں ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریبی بدل ہیں بہ مقابلہ ایک ریڈیو سٹ اور ایک موٹر گاڑی کے۔ چنانچہ جس چیز کا جتنا زیادہ قریبی بدل دستیاب ہوگا اتنا ہی زیادہ ان اشیا کی طلب لچک دار ہوگی اور کسی شے کی طلب جتنی زیادہ لچک دار ہوگی اتنا ہی زیادہ قیمت بڑھانے کے معاملے میں اس شے کے بنانے والے کی پوزیشن کمزور ہوگی۔ تاوقتیکہ مکمل مسابقت کی محدود کرنے والی صورت میں بدل اتنے قریبی اور یکساں ہوں کہ تمام خریداروں کو مکمل طور پر برگشتہ کیے بغیر قیمت میں کوئی بھی اضافہ ممکن نہ ہو۔

لیکن یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ اگرچہ اکثر و بیشتر شے کا کوئی نہ کوئی بدل ملتا ہے مگر اس میں تسلسل نہیں پایا جاتا، مطلب یہ ہے کہ کسی شے کا ایک قریبی بدل تو پایا جاتا ہے۔ مثلاً پام آلیو صابن کا بدل پیئرس صابن ہے۔ ان میں کسی ایک صابن کی قیمت میں ذرا قابلِ لحاظ اضافہ ہوتو ہم کالے صابن کو چھوڑ ہرے صابن یا ہرے صابن کو چھوڑ کر کالے کو خریدنے لگیں گے۔ مختلف برانڈ کے صابن تو ایک دوسرے کے قریبی بدل ہیں مگر بہ حیثیت مجموعی جنس صابن کا کوئی بدل جس کو صابن کے بدلے بہ آسانی استعمال کیا جاسکتا ہو نہیں ملتا۔ غور کرنے پر بہت دور کا ایک بدل نظر آتا ہے اور وہ ہے تیل اور جھاواں (Sciaper) جس کا استعمال قدیم رومہ والے کرتے تھے۔ لیکن آج ہم بہ آسانی اس کے استعمال کی طرف مائل نہ ہوں گے۔ نہانے میں کام آنے والے تمام صابنوں کی قیمت میں قابلِ لحاظ اضافہ بھی ہوجائے تو بھی ہم ان کو چھوڑ کر رومہ والوں کا قدیم طریقہ استعمال نہیں کریں گے بلکہ صابن ہی استعمال کریں گے۔ مندرجہ بالا بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک تاجر جو بطور بدل استعمال ہونے والی تمام اشیا کی قیمت کو کنٹرول کرسکے اس کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی پیداوار کی قیمت میں قابلِ لحاظ اضافہ کرکے خریداروں کا اچھا خاصا استحصال کرلے۔ اجارہ کی پوزیشن ان دو باتوں کی موجودگی میں بہت مضبوط ہوجاتی ہے۔ ایک یہ کہ اس کی پیداوار کے متعدد بدل کا نہ پایا جانا اور دوسرے یہ کہ جو قریبی بدل دستیاب ہوں وہ سب اس کے کنٹرول میں ہوں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اجارہ دار اپنی پیداوار کی قیمت میں قابلِ لحاظ اضافہ کرکے بھی کافی مقدار میں اپنا مال بیچ کر صارفوں سے بہت منافع کما سکتا ہے۔

نہ صرف یہ کہ ''جنس'' کی تعریف کرنے میں دشواریاں ہیں بلکہ اس میں بھی دشواریاں ہیں کہ ''تنہا بیچنے والے'' (The Sole Seller) کی کیا تعریف کی جائے۔ یہ فرض کرنا تو ایک مضحکہ خیز بات ہوگی کہ کوئی تاجر اس وقت تک اجارہ دار نہیں ہوسکتا جب تک کہ رسد پر اس کا مکمل قبضہ نہ ہو۔ یعنی شئے متعلقہ یا خدمت متعلقہ سوائے ایک تاجر کے کسی دوسرے کے پاس سے قطعاً نہ مل سکے۔ یہ بھی ایک مضحکہ خیز بات ہوگی اگر ہم کہیں کہ بجلی سپلائی کرنے والی مقامی کمپنی کی حیثیت اجارہ دار کی اس لیے نہیں ہے کہ اکا دکا لوگوں کے پاس

بجلی پیدا کرنے والے اپنے جز پیٹر ہیں۔ یہ بھی ایک بے تکی بات ہوگی اگر ہم اعلان کردیں کہ چند تاجر بہ حیثیت مجموعی اجارہ دار کی حیثیت نہیں رکھتے اس لیے کہ ان کو وقتاً فوقتاً اپنا اپنا مال بیچنے کے لیے آپس میں مقابلہ و مسابقت کرتا ہوا دیکھا گیا ہے۔ اجارہ دار اور غیر اجارہ دار کے درمیان خطِ فاصل کے کھینچنے میں دشواری صرف اسی موضوع اجارہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ دشواری تو علم معاشیات میں ہر قدم پر پیش آتی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے دوسرے علوم میں بھی یہ دشواری مشترک ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ پکے اجارے اور مکمل حالاتِ مسابقت کے درمیان متعدد اور مسلسل مدارج ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح روشنی اور تاریکی کے درمیان، صحت اور مرض کے درمیان۔ اس دشواری کے باوجود اجارہ اور مسابقت کے درمیان جو لازمی فرق ہے وہ نمایاں ہی رہتا ہے۔ اگلے ابواب میں ہمارا زیادہ تعلق انہی دشواریوں سے رہے گا جو اسی تسلسل (یعنی اجارہ اور مسابقت کے درمیان متعدد مدارج کا یہ تسلسل پایا جاتا) کی پیداوار ہیں۔

یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ ''اجارہ'' یا ''اجارہ دار'' کی کوئی سیدھی سادی تعریف پیش کرنا ناممکن ہے۔ بعض کاروبار میں نیک نامی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور ان کی نوعیت بھی ایسی ہوتی ہے کہ ان میں نئے لوگوں کا داخلہ مشکل ہوتا ہے (مثلاً جواہرات وزیورات یا نوادرات کی تجارت) ایسے کاروبار میں جو چند کمپنیاں پہلے سے موجود ہوتی ہیں ان کے درمیان آپس کی مسابقت ناکمل (Imperfect Competition) قسم کی ہوتی ہے لہٰذا ان کے لیے یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ ان میں سے کوئی ایک اپنے مال کے دام کو بڑھا کر بھی کم و بیش حسب سابق مقدار میں فروخت کرتا رہے۔ ہم ایسے تاجروں کو بھی اجارہ دار ہی کہیں گے اس لیے کہ اپنے مال کی طلب کو کسی قابل لحاظ حد تک متاثر کیے بغیر وہ اپنی قیمتوں میں ایک حد تک اضافہ کرسکتے ہیں۔ جس کاروبار میں نیک نامی کی بھی زیادہ اہمیت نہ ہو اور جہاں اشیائے بدل بھی بہ آسانی ملتی ہوں وہاں اگر مختلف فروشندوں کے درمیان مقابلہ مکمل نہ بھی ہو تو ایسی صورت حال کو ہم مقابلہ ہی کہیں گے نہ کہ اجارہ۔ لہٰذا اجارہ دار وہ تاجر ہے جو اپنے مال کی قیمت کچھ بڑھا بھی دے تو اس کے مال کی بکری میں کوئی خاص کمی نہ آئے۔

□□□

آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح

مرتب: ابوالکلام قاسمی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے آزادی سے تقریباً ربع صدی قبل سے نصف صدی بعد تک کے معتبر طنزیہ و مزاحیہ مضمون نگاروں کو اس کتاب میں یکجا کیا ہے، جن میں انجم مانپوری، ملّا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، حسنین عظیم آبادی، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، شفیقہ فرحت اور اعجاز علی ارشد جیسے 25 قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس انتخاب سے آزادی کے بعد لکھے جانے والے مزاحیہ ادبی سرمایے کی ارتقائی منازل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ متن اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں ہے۔

صفحات: 655، قیمت: -/457 روپے

انقلاب 1857

مرتب: پی. سی. جوشی

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دور رس اثرات مرتسم ہوئے۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے یہ پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ اس کتاب میں مختلف شعبہ ہائے حیات پر، اس کے اثرات کا ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں نے بھی جائزہ لیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔

صفحات: 386، قیمت -/215 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

اردو خبرنامہ

اردو کی ترقی کے لیے قومی تحریک کی ضرورت

● پٹنہ۔ ملک میں اردو زبان کے تحفظ اور اس کی ترقی کے لیے قومی تحریک کی ضرورت ہے۔ قومی سطح پر ایک مضبوط سیاسی قوت ارادی کے ساتھ تحریک چلا کر اردو کی ترقی کرنی ہوگی۔ اس کی ذمے داری خاص کر ان لوگوں پر ہے جو اسے اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں۔ سچر کمیٹی نے ہندوستانی مسلمانوں کی زمینی سچائی کو سامنے رکھا۔ ہندوستان میں پوری دنیا کے 10 فیصد مسلمان رہتے ہیں۔ یہ باتیں ہندوستان کے نائب صدر حامد انصاری نے سنیچر کو پٹنہ میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے بانی خان بہادر خدا بخش کی 100 ویں برسی پر منعقد میموریل لیکچر میں کہیں انھوں نے کہا کہ ملک کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے 1954 میں کئی ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سے اردو زبان کو نظر انداز کرنے کے بارے میں تشویش ظاہر کی تھی۔ کئی ریاستوں میں اردو کے فروغ کے لیے پہل بھی ہوئی لیکن آزادی کے 62 سال بعد بھی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ ملک کی زیادہ تر ریاستوں میں اردو زبان آج بھی نظر انداز ہو رہی ہے۔ مسٹر انصاری نے کہا کہ 2003 میں اردو زبان پر ہوئی بین الاقوامی کانفرنس میں یہ کہا گیا تھا کہ اردو غیر ممالک میں کافی پھل پھول رہی ہے لیکن ہندوستان میں اس کی خاطر خواہ ترقی نہیں ہو پائی ہے۔ سیاسی قوت ارادی کے ساتھ قومی سطح پر تحریک چلا کر ہی اس زبان کی ترقی یقینی بنائی جاسکتی ہے۔ اردو زبان اب بیشتر مدرسوں میں ہی پڑھائی جاتی ہے اور دوسرے اسکولوں کے نصاب میں اس کا مقام نہیں کے برابر ہے۔ اس موقع پر وزیراعلیٰ نتیش کمار نے کہا کہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کی جتنی توسیع و ترقی ہوگی اتنا ہی لوگوں کو فائدہ ملے گا۔ انھوں نے کہا کہ یہ لائبریری ملک کی انمول وراثت ہے۔ ہزاروں لوگوں نے یہاں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ انھوں نے خدا بخش خاں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ نادر مخطوطات تو جمع کرتے ہی تھے ایک شاعر اور وکیل اور پیشکار سے نظام حیدرآباد کے چیف جسٹس بھی بنے۔ ایسی عظیم شخصیت کو یاد کرنے ہم یہاں آئے ہیں اور یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے۔ گورنر مسٹر دیوانند کنور نے لائبریری کی خصوصیت اور اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالی اور لائبریری کے کاموں کی ستائش کی۔ خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر امتیاز احمد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور تقریب میں نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ملک کی ترقی بغیر تعلیم کے ناممکن

● کالی کٹ مرکز نگر۔ 25 جنوری، ہندوستان کی ترقی کا خواب اس وقت تک ادھورا رہے گا جب تک کہ سماج کا ہر بچہ تعلیم سے مزین نہ ہو جائے۔ تعلیم ہی سے سماج میں پھیلی برائیوں کا خاتمہ اور انسانیت کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل مسٹر کپل سبل نے کیا۔ مرکزی وزیر نے کہا کہ تعلیم کا مقصد نوکری یا ڈگری حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ تعلیم کے ذریعے سماج میں پھیلی برائیوں کا خاتمہ کرنا ہے۔ بغیر تعلیم کے ملک و ملت کی ترقی ناممکن ہے۔ جامعہ مرکز الثقافۃ السنیہ میں منعقد اجلاس کے موقع پر مرکز بنات احرام ہاسٹل کا افتتاح کرنے کے بعد شیخ ابوبکر کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یقیناً ملک اور سماج کی ترقی کا عظیم کارنامہ جو آپ نے ریاست کیرالا کے اندر انجام دیا وہ کامیاب مستقبل کی ضمانت ہے۔ اس موقع پر شیخ ابوبکر نے اپنے خطاب میں کہا کہ ریاست کیرالا کی تعلیمی پیش رفت ہندوستان کے کامیاب مستقبل کی ضمانت ہے جہاں نہ تو کوئی فساد ہے اور نہ کوئی جھگڑا بلکہ تمام مذاہب کے لوگ ایک ساتھ مل جل کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ ادارہ ہندوستان کا واحد مرکزی ادارہ ہے جہاں کشمیر، ہریانہ، پنجاب، گجرات، جھارکھنڈ مہاراشٹر، وغیرہ کے طلبہ دینی و عصری تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ شیخ ابوبکر نے کہا کہ سنی جمعیۃ العلما مرکزی مدرسہ بورڈ کی مکمل تائید کرتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مرکزی مدرسہ بورڈ اس دور کی اہم ضرورت ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر عبدالحکیم ازہری، این کے شرما جی، پروفیسر عبدالحمید نے بھی خطاب کیا۔ (ہمارا سماج، دہلی)

جنوبی ایشیائی زبانوں کا نواں بین الاقوامی اجلاس

● جنوبی ایشیائی زبانوں کا نواں بین الاقوامی اجلاس (ICOSAL-9) سی آئی آئی ایل میسور اور پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے اشتراک سے 7 تا 9 جنوری 2010 پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں منعقد ہوا جس میں ملک و بیرون ملک کے تقریباً 300 مندوبین نے شرکت کی۔ اس اجتماع میں 36 سیشن ہوئے جن میں عام لسانیات، سماجی لسانیات، توضیحی و تاریخی لسانیات، صرفیات و نحویات، زبان و تدریس، ترجمہ نگاری اور کمپوٹیشنل لنگوسٹکس جیسے مضامین پر تقریباً 170 مقالات پیش کیے گئے۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر

جسپال سنگھ (علیگ) نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ، پرنسپل این آر ایل سی پٹیالہ نے ادا کیے۔ ڈاکٹر جسپال سنگھ نے اپنے صدارتی خطبے میں جنوبی ایشیائی لسانی تاریخ وتہذیب نیز لسانی نیرنگیوں کو بنیاد بناتے ہوئے اس کرۂ ارض کو دنیا کا اہم ترین حصہ قرار دیا۔ ڈاکٹر سنگھ نے گلوبلائزیشن کی وجہ سے علاقائی اور مقامی زبانوں پر مرتب ہونے والے منفی اثرات کا بھی جائزہ لیا۔

افتتاحی اجلاس کے مہمانِ خصوصی میں ڈاکٹر اومکار ناتھ کول، ڈاکٹر ستیندر سنگھ نور اور ڈاکٹر ذخارین بورس، ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی تھے۔ ڈاکٹر او این کول نے ایکوسال کے آغاز دارتقا اور مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ماضی میں منعقدہ کانفرنسوں کی کارکردگی کا جائزہ بھی پیش کیا۔

افتتاحی اجلاس میں دو کلیدی خطبے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر جے ایس پوار نے اپنے خطبے میں برصغیر ہندو پاک میں زبانوں کی صورتِ حال اور لسانی سیاست کی غیر سنجیدگی پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے اس رویے کو زبان، معاشرت اور تہذیب کے لیے نقصان دہ قرار دیا۔ دوسرا کلیدی خطبہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل لینگویجز اینڈ سیویلائزیشن، پیرس (فرانس) کی پروفیسر اینی مونٹاٹ نے پیش کیا۔ اینی نے جدید ہند آریائی زبانوں پر بالعموم اور اردو زبان پر بالخصوص روشنی ڈالتے ہوئے امیر خسرو، خان آرزو، شاہ مبارک آبرو، انشا اور ناسخ کے لسانی نقطۂ نظر پر حیرت انگیز حد تک باریک بینی کا مظاہرہ کیا اور سب رس، باغ و بہار، نوطرزِ مرصع اور رانی کیتکی کی کہانی میں استعمال کی گئی زبان اور اسلوب کے امتیازات پر بھی روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر ایس ایس نور نے اس امر پر خاص توجہ مرکوز کرائی کہ جنوبی ایشیائی زبانوں کا تقابلی مطالعے کے لیے زبان وادب پر فراہم مواد کے زیادہ سے زیادہ تراجم کرائے جائیں تاکہ ہر ایک زبان کے اوصاف اور ادبی امتیازات عیاں ہوسکیں۔

افتتاحی اجلاس کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر آر کے بھٹ سندھی آئی آئی ایل اور پنجابی یونیورسٹی کے اس اشتراک کو ایک سودمند لائحۂ عمل قرار دیا۔ اس کانفرنس کے شریک منتظم ڈاکٹر جوگا سنگھ، صدر شعبۂ لسانیات و پنجابی لغت نگاری تھے۔

اس کانفرنس میں جنوبی ایشیا کی دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو سے متعلق مختلف موضوعات پر بھی مقالات پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر خطیب سید مصطفےٰ نے اردو عربی کے ریلیٹو کلاز کا تقابلی وتخالفی مطالعہ پیش کیا۔ ڈاکٹر خطیب نے حروفِ ربط کا تقابل کرتے ہوئے اردو کے جو، جس، جن، جنھوں، وغیرہ کا عربی حروفِ ربط ُ ما ٗ الذی ٗ الذان، الذین، وغیرہ سے تقابل کرتے ہوئے ان کے تعملاتی نوعیت کا محاکمہ بھی کیا۔ محترمہ ناہید صبا نے ''ہندوستان میں اقلیتی زبانوں کے تذبذب'' پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ''آئین ہند میں اقلیت'' کی اصطلاح کا نہ صرف یہ کہ خلاصہ کیا بلکہ ''اقلیتی زبانوں'' کی صورتِ احوال اور تحفظات پر استدلالی اور منطقی انداز میں گفتگو کی۔ محترمہ پیکر فاطمہ (علی گڑھ) نے قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' میں دخیل لفظوں اور ان سے مرتب ہونے والے اثرات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے انگریزی اور دیگر زبانوں کے مستعار و دخیل الفاظ کا نہ صرف یہ کہ لسانیاتی اور اسلوبیاتی جائزہ لیتے ہوئے قرۃ العین حیدر کے لسانی کلیشے کا محاکمہ کیا بلکہ ان کے استعمال سے مغربی تہذیب و ثقافت کو پرکشش بنانے میں عینی آپا کی ہنرمندی کا بھی جائزہ لیا۔ انھوں نے آگ کا دریا کا شماریاتی محاکمہ کرتے ہوئے تقریباً 600 سے زائد مستعار و دخیل لفظوں کی شناخت کی۔ کانفرنس نہایت کامیاب رہی۔ (ڈاک سے)

اردو کی ترقی کے لیے مرکزی حکومت پابند عہد

● نئی دہلی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے آج یہاں بتایا کہ اردو زبان وتہذیب کو بچانے کی ذمے داری صرف اردو والوں کی ہی نہیں ہے۔ اردو والوں کا تشخص نہ صرف یہ ہے کہ وہ اس زبان وادب کی وراثت کا حق رکھتے ہیں بلکہ بہ حیثیت ہندوستانی شہری آزاد ہندوستان میں ان کا یہ حق بھی ہے کہ آئین ہند میں لسانی اقلیتوں کی زبانوں اور ثقافتوں کے تحفظ و ترقی کی جو ضمانت دی گئی ہے اسے پورا کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ اردو والوں کو ان کا حق دلائے۔ ہماری موجودہ مرکزی حکومت اس سلسلے میں پابند عہد ہے۔ اسی لیے وزیر اعظم کے 15 نکاتی پروگرام برائے اقلیتی فلاح و بہبود کے تحت اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ایک ایکشن پلان تیار کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ زبان وادب اور کلچر کے تحفظ وترقی کے لیے صاحب وسائل اور تعلیم یافتہ افراد ذمے دار ہوتے ہیں، لیکن اردو بولنے والوں کی اکثریت اقتصادی اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ہے لہٰذا ان سے یہ توقع بے جا ہے کہ وہ اپنی زبان اور ثقافت کو بچائیں اور ترقی دیں۔ بہ حیثیت ہندوستانی شہری ان کے ثقافتی ولسانی حقوق کا تحفظ اور ترقی حکومت کا فرض ہے بالخصوص آئین کی دفعات 29 اور 30 کے تحت یہ تحفظ اقلیتوں کے بنیادی حقوق میں شامل ہے۔ ڈاکٹر بھٹ کے مطابق ''ہمارا اہم ترین کام یہ ہے کہ ہم نے اردو کی احتجاجی تحریک کو ایک مثبت مہم کا حصہ بنا دیا اور فروغ اردو کے لیے ایک مربوط پالیسی مرتب کی جس میں اردو زبان وادب اور تعلیم کے مجموعی طور پر فروغ کے لیے اہم اقدام کیے گئے اور آئندہ بھی کیے جائیں گے۔'' انھوں نے بتایا کہ حال ہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مولانا آزاد اردو یونیورسٹی میں ''اکادمی آف پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف اردو'' قائم کی گئی ہیں جن میں اردو میڈیم کے اساتذہ کو پیشہ

درانہ تربیت دی جارہی ہے، جو لوگ سول سروسز میں اردو ایک مضمون کے طور پر منتخب کریں گے ان کو مفت کوچنگ اور کورس کی کتب فراہم کرائی جائیں گی۔ بچوں کا رسالہ شروع کرنے کے لیے جلدی ہی ایک ایڈوائزری بورڈ تشکیل دیا جارہا ہے۔" (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

قومی اردو کونسل کی کمیٹی ان ڈسٹنس کی میٹنگ

● نئی دہلی۔ 13 جنوری، قومی اردو کونسل کی کمیٹی ان ڈسٹنس لرننگ کی میٹنگ میں آج یہاں ایک سالہ اردو ڈپلوما کورس کے 63 مراکز، دو سالہ ڈپلوما ان فنکشنل عربک کے 36 مراکز اور ایک سالہ سرٹیفکیٹ ان فنکشنل عربک کے 31 نئے مراکز منظور کیے گئے۔ پروفیسر نسیم بھابیہ کی کنوینر شپ میں میٹنگ کا آغاز کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے ایجنڈے پر روشنی ڈالی۔ میٹنگ کے شرکا میں پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی (شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)، پروفیسر غضنفر علی (سینٹر فار پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف اردو ٹیچر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی)، ملک العزیز (چنئی) اور جناب سید پرویز (نئی دہلی) شامل تھے۔ اسپیشل انوائی کے طور پر جناب چندر بھان خیال (وائس چیئر مین، قومی اردو کونسل) نے بھی شرکت کی۔ مذکورہ منظوریوں کے ساتھ ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ان مراکز کی تعداد بالترتیب 317652 اور 272 ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ جو طلبہ اردو، عربی اور فارسی زبان کو مسابقتی امتحانوں (Competative Exams) بالخصوص آل انڈیا سول سرویسز اور اسٹیٹ پبلک سروس کمیشن کے امتحانوں میں انتخاب کریں گے، ان کو تعلیمی مواد کی فراہمی اور ضروری تربیت کے لیے کونسل اپنے مصارف پر مراکز قائم کرے گی۔ کمیٹی نے عربی زبان کا انٹر پریٹیشن کورس بھی جے ایم آئی، اے ایم یو، ایم اے این یو یو، جے این یو، ڈی یو، آئی ایف ایل او، عثمانیہ یونیورسٹی اور نیو کالج آف کامرس میں قائم کرنے کا فیصلہ لیا تاکہ عربی طالب علم ان سے استفادہ کرسکیں۔ (اخبار مشرق، دہلی)

قومی اردو کونسل کولکاتا کو نارتھ ایسٹ اور مغربی بنگال کا مرکز بنائے گی

● کولکاتا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے یہاں اعلان کیا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کولکاتا کو مغربی بنگال اور نارتھ ایسٹ کا مرکز بنائے گی۔ وہ کونسل کے جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات میں تقریر کر رہے تھے۔ اتوار کے روز بھارتیہ بھاشا پریشد کے ہال میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مختلف کورسیز مکمل کرنے والے کامیاب طلبہ وطالبات کو کونسل کی جانب سے اسناد اور انعامات دیے گئے۔ "آزاد ہند" کے مدیر اور راجیہ سبھا کے ممبر احمد سعید ملیح آبادی کی صدارت میں ہونے والی اس تقریب میں قومی اردو کونسل اور بنگال اردو اکادمی کے ممبروں کے علاوہ بڑی تعداد میں اردو کے ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ جلسے کے صدر نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ کونسل کے ڈائرکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ایک تیز رفتار انجن کی طرح ہیں جو اردو کے فروغ کی گاڑی کو آگے کی طرف لے جارہے ہیں۔ قبل ازیں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے کہا کہ کولکاتا میں نہ صرف اردو صحافت بلکہ جدید اردو نثر کا آغاز ہوا۔ اب اس شہر کو قومی کونسل اردو کے ایک اہم مرکز کے طور پر فروغ دے رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس شہر کو اردو کا ایک مرکز تو بنایا ہی جائے گا اس کے ساتھ پورے مغربی بنگال میں اردو کے 20 مراکز اردو اکادمی کے تعاون اور اشتراک سے کھولے جائیں گے۔ نند کشور وکرم نے اردو طلبہ کو کمپیوٹر کا کورس کامیابی سے مکمل کرنے پر مبارک باد دی اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ "راشٹریہ سہارا" کے چیف آف بیورو اسد رضا نے کہا کہ راجیو گاندھی نے سارے ہندوستان میں کمپیوٹر کے فروغ کے لیے اہم رول ادا کیا۔ بنگال اردو اکادمی کی چیئر پرسن ڈاکٹر شہناز نبی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو مکمل کرنے والے طلبہ کی پریکٹس کے لیے اپنے کمپیوٹر فراہم کرے گی۔ اس موقع پر فراغ روہوی، شبیر احمد اور اردو کے دیگر ادیبوں اور دانشوروں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کو مغربی بنگال میں اردو تعلیم اور اردو والوں کے مسائل سے تحریری طور پر آگاہ کیا۔ ڈاکٹر بھٹ نے ان مسائل کو حل کرنے کا وعدہ کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو زبان، صحافت کا مستقبل روشن

● نئی دہلی۔ 10 جنوری، وہ زبان رواج پاتی ہے جس کو عوام میں قبولیت حاصل ہوتی ہے اور لوگوں کو سمجھ میں آتی ہے، اردو زبان اس معیار پر پورا اترتی ہے، لہٰذا اردو زبان کے مستقبل کو کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ اردو زبان تہذیب کی زبان ہے علم کی زبان ہے۔ لہٰذا اردو والوں کو زبان کی بقا کے سلسلے میں فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اردو زبان مختلف مصنوعات کے اشتہار کی زبان بن جائے تو اس سے اردو کے فروغ کی رفتار تیز ہوگی۔ یہ باتیں آج یہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو کے فروغ میں میڈیا کا کردار کے عنوان سے منعقد سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے اس یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے صدر پروفیسر اختر الواسع نے کہی۔ میڈیا کے کردار پر بات کرتے ہوئے مختلف مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے میڈیا کی زبان اور اس میں اردو کے الفاظ کی شمولیت پر اظہار خیال کیا۔ سہیل انجم نے مختلف چینلوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے چینلوں کی نوعیت سے بھی آگاہ کیا اور مختلف نامہ نگاروں کے حوالے سے

بتایا اور ثابت کیا کہ مختلف چینلوں میں اردو کا کم یا زیادہ استعمال نامہ نگاروں کے کہنے کی زبان پر بھی منحصر ہے۔ اس سلسلے میں غوث سیوانی نے بھی بات آگے بڑھاتے ہوئے مکمل اور بھرپور تجزیہ کیا جس کی کافی پذیرائی کی گئی۔ اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور مہمان خصوصی بصیر احمد خاں نے اپنے دنیا بھر کے دورے کے حوالے سے اردو پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اردو کے مستقبل کے سلسلے میں مایوس ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ انھوں نے خصوصاً جنوبی افریقہ کے دورے کے حوالے سے بتایا کہ وہاں بھی اردو کا مرکز قائم ہے اور دینی تعلیم سے قبل اردو پڑھائی جاتی ہے جب کہ عوام کی زبان اردو نہیں ہے۔ جامعہ ہمدرد کے صدر شعبۂ دینیات ڈاکٹر غلام یحییٰ نے اردو کے فروغ میں دینی لٹریچر کے کردار پر بات کرتے ہوئے کہا کہ جو مدرسے کے نہیں ہوتے وہ اچھی زبان نہیں بولتے۔ اس کی دلیل میں انھوں نے ایک دو الفاظ مثلاً حتی المقدور وغیرہ کا ذکر کیا جس کا ان کے مطابق اردو والے صحیح تلفظ نہیں کرتے۔ پروگرام میں نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے اور پروگرام کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

اردو ادب میں خواتین کی خدمات

● سہارنپور۔ سماجی تنظیم پرچم کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے اسلامیہ ڈگری کالج میں ''اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ'' کے موضوع پر دو روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر قدسیہ انجم اور نظامت شاہد زبیری نے کی، جبکہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اردو ادب میں خواتین کی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا۔ کہ اردو ادب میں خواتین کی خدمات سے کسی طور انکار ممکن نہیں ہے۔ اردو کی پہلی خاتون ناول نگار رشیدۃ النسا کے ناول ''اصلاح النسا'' سے لے کر قرۃ العین حیدر تک ہر صنف ادب میں خواتین نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، ادا جعفری، ملکہ نسیم، ترنم ریاض، زاہدہ حنا اور فاطمہ حسن جیسے نہ جانے کتنے معتبر نام ہیں جن کی ایک پوری کہکشاں بچی ہوئی ہے، جس سے اردو ادب کا منظر نامہ روشن ہے۔

ڈاکٹر فاروق بخشی نے اپنے مقالے ''جدید اردو نظم اور تانیثی'' اظہار کے اسالیب'' میں فہمیدہ ریاض کے بعد کشور ناہید کو تانیثی تحریک کی نمائندہ نظم نگار قرار دیا اور کہا کہ اب شاعرات کی فکر محدود نہیں ہے۔ نئے مسائل کی گونج اور روشن مستقبل کے لیے جدوجہد شاعرات کے یہاں اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ابھی خواتین قلم کاروں کو ستاروں سے آگے کے جہاں پر نظر رکھ کر قدم بڑھانا ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش کا سفر ان کے لیے ضروری ہے اور اپنی پیش رو خواتین قلم کاروں سے آگے کی منزل طے کرنی ہے۔

سیمینار کی شمع اسلامیہ ڈگری کالج کے پرنسپل آر کے شرما، جین ڈگری کالج کے پروفیسر سریندر نشچل، مہاراج سنگھ کالج کے پروفیسر یوگیش چھمر اور معروف قلم کار انور علی ایڈووکیٹ نے روشن کی۔ مسلم گرلز انٹر کالج کی طالبات نے ''سارے جہاں سے اچھا'' ترانہ پیش کیا۔ آر کے شرما نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ شرکا میں اسلامیہ انٹر کالج کے پرنسپل انوار صدیقی، اختر علی خاں، پروفیسر سریندر نشچل، قاضی شوکت حسین، ڈاکٹر ایوب، رحمٰن عزیز، آصف شمسی، ڈاکٹر بلال عاصم پیرزادہ، ارشد علیم، ڈاکٹر فرمان، ڈاکٹر عارف، ارشد شریفی، فرحان قاضی، فرزانہ شاہد، ڈاکٹر شہناز چاندنی، عظمیٰ فرحت اور عروج شمسی نمایاں تھے۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''فارسی مثنوی'' پر تین روزہ سیمینار

● علی گڑھ۔ 3 فروری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ''فارسی مثنوی'' پر تین روزہ بین الاقوامی سیمینار کے افتتاحیہ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر عبدالودود اظہر نے کہا کہ فارسی ادب کا شاندار محل قدیم بھی ہے اور وسیع بھی، اس کی وسعت میں تنوع اور رنگارنگی ہے، در و دیوار مزین و آراستہ ہیں لیکن اس کے صدر دروازے کے دائیں بائیں جو دو ستون کھڑے ہیں ان ستونوں پر ہی صدر دروازہ ٹکا ہوا ہے۔ ایک ایرانی تاریخ کا دربان اور دوسرا اسلامی فکر کا ضامن اور نگہبان۔ انھوں نے کہا کہ ایرانی قومیت کے احیا کے لیے فردوسی نے اس کو نہ صرف توسیع دی بلکہ ایران کو ایک حماسئہ ملی دیا جس کا ہر جز روشن اور پرکشش ہے۔ انھوں نے کہا کہ فردوسی کا شاہنامہ فارسی مثنوی یا رزمیہ کا یہ شاہکار اپنی مثال آپ ہے۔ ممتاز صحافی مسٹر کلدیپ نیر نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے بی.اے. تک فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایران اور ہندوستان کے رشتے بہت قدیم ہیں۔ مہاتما بدھ کے عہد میں بھی ایران اور ہندوستان میں اسلام ایک ہزار سال قبل آیا تھا اور اسلام کا ہندوستان کی تہذیب و ثقافت پر گہرا اثر پڑا ہے۔ مسٹر کلدیپ نیر نے کہا کہ ہندوستان کے مقابلے میں ایران کی خواتین کو زیادہ آزادی حاصل ہے اور وہ ایرانی معاشرے میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ ممتاز مورخ پروفیسر عرفان حبیب نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ عربی مورخ طبری نے ایران کی تاریخ لکھی تھی۔ فردوسی کی مثنوی ایرانی شہنشاہوں کی تاریخ ہے اور وہ چاہتا تھا کہ ایرانی شہنشاہیت کا احیا

ہو۔ انھوں نے کہا کہ ایران میں مذہب سے زیادہ ثقافت مستحکم ہے اور فارسی کی نشاۃ ثانیہ ایران کی شاندار تاریخ کی عکاسی کرتی ہے۔ ہندوستان میں ایران کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر کریم نجفی نے مثنوی کی تاریخ اور اس کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہندوستان نے مثنوی کے فن کو بہت آگے بڑھایا۔ انھوں نے علامہ اقبال اور علامہ شبلی نعمانی کا بھی حوالہ دیا۔ ایران کے کونسلر جنرل پروفیسر محمد حسین کریم نے کہا کہ پانچ سو سال تک فارسی ہندوستان کی اہم زبان رہی ہے مگر جب انگریزوں نے اس ملک پر قبضہ کرلیا تو انھوں نے فارسی کو اہمیت دینا ختم کر دیا مگر ہندوستان میں فارسی آج بھی زندہ ہے۔ ہندوستان اور ایران کے درمیان فارسی آج بھی رابطے کی زبان کے طور پر کام کررہی ہے۔ اس سے قبل انٹرنیشنل سیمینار کی ڈائرکٹر پروفیسر آذرمی درخت صفوی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اس تین روزہ سیمینار میں ایران، تاجکستان، افغانستان، پاکستان اور ترکی سمیت ہندوستان بھر سے سات مندوبین حصہ لے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مثنوی کو ہر دور میں مقبولیت حاصل رہی ہے۔ شاہنامہ فردوسی، بوستان سعدی اور مثنوی مولانا روم ایران کی مشہور مثنویاں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حضرت امیر خسرو نے اپنی مثنوی میں ہندوستان کے عوام اور یہاں کی ثقافت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے پھولوں، اس کی خوبصورتی اور سماجی حالات کو بھی پیش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پنجابی مثنوی ہیر رانجھا کو بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ تاجکستان یونیورسٹی کی وائس چانسلر پروفیسر امید نے مرزا اسداللہ خاں غالب، زیب النسا اور علامہ اقبال کی مثنویوں پر بھرپور روشنی ڈالی۔ آرٹس فیکلٹی کی ڈین اور فارسی کی پروفیسر ماریہ بلقیس نے مثنوی کی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس بین الاقوامی سیمینار سے طلبہ اور محققین کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ اس موقع پر آدھا درجن سے زائد کتابوں کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ (صحافت، دہلی)

ترقی پسند تحریک کے احیا کی ضرورت

● نئی دہلی۔ 6 فروری، اردو ادب کی تاریخ میں جب تک ترقی پسند تحریک اور اس کے نظریات باقی رہیں گے پروفیسر قمر رئیس کا ذکر ہوتا رہے گا۔ وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پاکستان میں بھی ان کی تعزیتی تقریبات کا سلسلہ رہا۔ وہ ترقی پسند تحریک کی مضبوط آواز تھے۔ اس تحریک کی ازسر نو تشکیل وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار پاکستان کے معروف ادیب وصحافی راحت سعید نے کیا۔ وہ اردو اکادمی دہلی کے زیراہتمام منعقد دوروزہ سیمینار ''قمر رئیس: حیات دکارنامے'' کے افتتاحی اجلاس میں بطور مہمان خصوصی اپنے تاثرات پیش کررہے تھے۔ اس اجلاس کی صدارت معروف افسانہ نگار رتن سنگھ نے کی جبکہ نظامت کے فرائض پروفیسر ارتضی کریم نے انجام دیے۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے معروف فکشن نگار جوگیندر پال نے کہا کہ قمر رئیس ہمہ وقت امکانات کی تلاش میں رہتے تھے اور امکان ہی وہ شے ہے جس سے انسان زندہ رہتا ہے۔ قبل ازیں اپنے استقبالیہ خطاب میں اکادمی کے وائس چیئرمین سید شریف الحسن نقوی نے قمر رئیس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ قمر رئیس کوالٹی سے کبھی کمپرومائز نہیں کرتے تھے خواہ وہ ادب ہو یا کوئی تنظیمی کام۔ وہ ہمت اور حوصلہ مندی سے کام کرتے تھے۔ سیمینار کمیٹی کے کنوینر پروفیسر عتیق اللہ نے قمر رئیس کے تنقیدی ادب کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کا اصل کردار عملی تنقید میں نظر آتا ہے۔ صدارتی تقریر میں رتن سنگھ نے کہا کہ قمر رئیس کا پریم چند پر تحقیقی کام نہ صرف اردو میں بلکہ ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی مقبول ہے۔ پروفیسر ارتضی کریم نے کہا کہ قمر رئیس دراصل ادب کے قمر اور قلم کے رئیس تھے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر ابن کنول، پروفیسر علی احمد فاطمی اور پروفیسر نعمان خان نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر احمد امتیاز نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر شمیم نکہت اور ڈاکٹر نگار عظیم نے اپنے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر خالد اشرف نے قمر رئیس اور ترقی پسند تنقید کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ پروفیسر قمر رئیس بڑے ادیب تو تھے ہی لیکن اس سے بڑے وہ انسان دوست تھے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ارتضی کریم، پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی اور پروفیسر حمید سہروردی نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر سراج اجملی نے قمر رئیس بہ حیثیت استاد، اقبال مسعود نے فکشن کے تنقیدی پہلو و امکانات، پروفیسر علی احمد فاطمی نے ترقی پسند تحریک: قمر رئیس کی نظر میں اور پروفیسر شارب ردولوی نے قمر رئیس اور نئی ترقی پسند تنقید کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ پروگرام کے آخر میں اردو اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے آئے ہوئے لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ہمارا سماج، دہلی)

بہار اردو صحافت کا مرکز رہا ہے

● گیا۔ 19 جنوری، گذشتہ روز گیا کے مخدوم محی الدین ہال میں انجمن ترقی اردو گیا اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی اشتراک سے ایک سیمینار ''بہار کی اردو صحافت'' معیار اور مسائل'' کے موضوع پر منعقد ہوا۔ افتتاحی خطبے میں سینئر صحافی عبدالقادر نے کہا کہ بہار اردو صحافت کا مرکز رہا ہے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری نے اس امر پر تشویش کا اظہار کیا کہ نئی نسل کی اردو زبان سے عدم دلچسپی کے باعث یہ ہندی اخبارات پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اردو اخبار و رسائل کا سرکولیشن دن بہ دن کم ہوتا جارہا ہے۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے اپنے مقالے میں بہار کی اردو صحافت کے ماضی کے

اوراق پلٹتے ہوئے اردو رسائل کے حوالے سے بتایا کہ اخبارات کی طرح ادبی رسائل و جرائد بھی معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ معصوم عزیز کاظمی نے کہا کہ سرکاری مراعات سے انگریزی اور ہندی صحافت فروغ پا رہی ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آزادیٔ ہند میں اردو صحافت کا ان دونوں زبان کی صحافت کے مقابلے زیادہ اہم رول رہا ہے۔ ڈاکٹر حسین الحق نے کہا کہ بہار کی اردو صحافت سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاہد احمد شعیب نے اپنے مقالے میں کہا کہ بڑی بڑی کمپنیاں چھوٹے چھوٹے اخبارات کو نگلنے کی تاک میں ہیں۔ بہار کی اردو صحافت کو اس سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ انظار اللہ نے کہا کہ اردو اخبارات کی محدود آمدنی ہی بہار کی اردو صحافت کے غیر اطمینان بخش معیار اور مسائل کا سبب ہے اس پر قابو پانا بے حد ضروری ہے۔ پروفیسر افصح ظفر نے اپنے مقالے میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ کارپوریٹ کلچر سے پوری صحافت متاثر ہو رہی ہے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

سرسید کے "تعلیمی مشن" کو آگے بڑھانے کی ضرورت

● علی گڑھ۔ 9 فروری، معروف عالم اور ممبر پارلیمنٹ مولانا اسرار الحق قاسمی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ سے اپیل کی کہ وہ تعلیم کی مشعل روشن کرنے کے لیے اسی طرح آگے آئیں جس طرح سرسید احمد خاں نے ناخواندگی کی تاریکی کو دور کرنے کے لیے اس عظیم ادارے کی بنیاد ڈالی تھی۔ مولانا قاسمی نے آج یہ بات لٹریری کلب کے زیر اہتمام آل انڈیا سرسید میموریل ایوارڈ کی تقسیم انعامات تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ مولانا قاسمی نے کہا کہ آج کے عہد میں نالج دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے جس کو ہر شخص تک پہنچانا ہماری ذمے داری ہے۔ مولانا قاسمی نے کہا کہ آج نوجوانوں کی طاقت کو ساری دنیا تسلیم کر رہی ہے، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس طاقت کو صحیح سمت دی جائے۔ انھوں نے کہا کہ بحث و مباحثہ کے مقابلوں سے نوجوانوں کی اس طاقت کو مثبت رخ دے کر اس کا صحیح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مولانا قاسمی نے علی گڑھ مسلم یونیورٹی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس ادارے میں سرسید کے زمانے سے ہی تعلیم کے ساتھ طلبہ کی تربیت کا کام بھی ہو رہا ہے اور اس ادارے کے طلبہ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی اس ادارے کا نام روشن کر رہے ہیں۔ مولانا قاسمی نے کہا کہ بحث و مباحثہ میں ماہر شخص نہ صرف اپنی روح کو پہچانتا ہے بلکہ دوسروں کے خیالات کا احترام کرنا بھی جانتا ہے اور یہ کسی بھی مہذب سماج کی ترقی کی علامت ہے۔ انھوں نے وائس چانسلر پروفیسر پی کے عبدالعزیز کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ سن 2020 میں یہ ملک ایک سپر پاور کی شکل میں ابھرے گا اور ان کی کوششوں کی بدولت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شاخیں پورے ملک میں پھیل جائیں گی۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر پی کے عبدالعزیز نے کہا کہ جنرل ایجوکیشن سینٹر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہے جہاں پر طلبہ کی شخصیت کی نشوونما ہوتی ہے۔ انھوں نے طلبہ پر زور دیا کہ وہ اپنی تعلیم میں لگے رہیں اور کیمپس میں پُر امن ماحول کی برقراری میں اپنا بھرپور تعاون دیں۔ انھوں نے کہا کہ طلبہ کو غیر ضروری اور غیر علمی کاموں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کے باصلاحیت طلبہ و طالبات نے تعلیم حاصل کر کے ملک و بیرون ملک بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ وائس چانسلر نے کہا کہ ایک اچھے مقرر کے لیے نالج اور وزڈم کا ہونا ضروری ہے۔ سینئر جرنلسٹ مسٹر وود ساجد نے پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ علی گڑھ تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہے اور وہ یہاں آنا اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ انھوں نے طلبہ سے کہا کہ وہ محض انعام جیتنے کے لیے نہیں بلکہ مقابلے میں حصہ لینے کے لیے اس طرح کے مقابلوں میں حصہ لیں اور قومی تعمیر کے کاموں میں فعال کردار ادا کریں۔ ڈین اسٹوڈنٹس ویلفیئر پروفیسر عین الحق خان نے اس موقعہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ صلاحیتوں کے دھنی ہیں۔ (ہمارا سماج، دہلی)

مادری زبان کا فروغ ضروری

● مرادآباد۔ 13 دسمبر، ہم سائنس و ٹیکنالوجی، میڈیکل وغیرہ کے شعبوں میں ہوئی نمایاں پیش رفت کو ترقی کا نام بھلے ہی دے لیں اور اقتصادی طور پر آج انسان بھلے ہی مضبوط ہو گیا ہو لیکن کیا حقیقت میں یہ اس کی اصلی کامیابی ہے؟ کیا اس انسان کا معاشرہ ترقی یافتہ کہا جا سکتا ہے؟ ایسے ہی سلگتے ہوئے مسائل پر آج ایک سیمینار میں اپنے خیالات کا اظہار مقالہ نگاروں نے کیا۔ مہاراجہ ہریش چندر ڈگری کالج میں منعقدہ ایک روزہ سیمینار "اردو کے بغیر معاشرے کی ترقی ناممکن" کے موضوع پر مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے جہاں اس عنوان کی ستائش کی گئی وہیں چند لوگوں نے اتفاق نہیں کیا۔ تقریباً تین گھنٹوں تک چلنے والے اس سیمینار میں لوگوں نے اپنے نظریات رکھتے ہوئے اردو کو ایک تہذیب بتایا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کسی ایک مذہب یا فرقے کی زبان نہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تمام قوموں نے اسی زبان سے سلیقہ سیکھا ہے۔ آج بھلے ہی سیکڑوں علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن اردو جیسی تہذیب کہیں نہیں ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کسی قوم کو ختم کرنا ہو تو اس کی تہذیب اور زبان کو ختم کر دو۔ یہ کہنا تھا ڈاکٹر آصف کا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں کہا کہ دنیاوی و تجارتی ضرورتوں کے تحت انگریزی و دیگر زبانیں ضروری ہیں تو اپنی تہذیب و

تمدن کی بقا کے لیے مادری زبان کا فروغ بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر منصور صدیقی نے اس عنوان سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کا عنوان اردو کی ترقی معاشرہ سے ہونا چاہیے تھا۔ انھوں نے جواز پیش کیا کہ سائنس وٹیکنالوجی کے حلقوں میں جو ترقیاں ہوئی ہیں وہ اردو کے بغیر ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر مجاہد فراز نے عنوان کو درست بتاتے ہوئے کہا کہ سائنس وٹیکنالوجی و مالی اعتبار سے معاشرے کو ترقی یافتہ کہا جاسکتا ہے لیکن کیا واقعی یہ ترقی ہے؟ انھوں نے دلیلیں دیتے ہوئے کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو جینے کے اطوار اور بولنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ تہذیب اردو سے ہی آتی ہے۔ مولانا یحییٰ بخاری نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو تہذیب بھی ہے۔ انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ اگر آپ اردو کا کوئی پروگرام سن رہے ہوں اور کوئی شخص انگریزی میں جواب دینے لگے تو لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے اور کسی بھی زبان کے پروگرام میں اردو کا استعمال کیا جائے تو اس میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ شہر امام حکیم سید معصوم علی آزاد نے اردو زبان کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں پڑھانے کے لیے حکومت پر زور دیا اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ اپنے گھروں میں بچوں کو اردو کی تعلیم لازمی طور پر دلائیں تا کہ اس زبان کو سیکھ کر معاشرہ تہذیب اور ثقافت سے روشناس ہو سکے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور ریاجن کلیان سمیتی کے باہمی اشتراک سے منعقد اس سیمینار کی صدارت ڈاکٹر حسن احمد نظامی نے کی۔ شہر امام مراد آباد نے سرپرستی کی۔ مہمان خصوصی سید یحییٰ بخاری صدر جامع مسجد یونائیٹڈ فورم دہلی تھے دیگر مہمانوں میں ڈاکٹر شمسی بدایونی، منصور عثمانی، ڈاکٹر ایس این سنگھ، ڈاکٹر وشواوتار، نسیم الحسن، انور عالم لطیفی موجود تھے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر ابوسعد، ڈاکٹر امتیاز، ڈاکٹر پرویز نظیر، ڈاکٹر احمد طارق، ڈاکٹر جمیل احمد، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر منصور احمد صدیقی، ڈاکٹر زیبا ناز، ڈاکٹر مجاہد فراز، ڈاکٹر محمد آصف نے اپنے مقالے پڑھ کر سنائے۔ اس موقع پر صحافت میں نمایاں کردار نبھانے والے تین اشخاص سید ہاشم علی، ذاکر علی بیگ وفہیم خاں کو مولانا یحییٰ بخاری کے بدست اعزاز سے نوازا گیا۔ اس پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے بھرپور تعاون ناصر حسین منصوری، ترنم پروین، کشش وارثی نے دیا۔

(صحافت، دہلی)

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے انعامات

● **بھوپال۔** 2 فروری، مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے اردو زبان، ادب اور صحافت کی گرانقدر خدمات کے لیے کل ہند اور صوبائی اعزازات کا آج اعلان کر دیا۔ اکادمی کی پریس ریلیز کے مطابق اکادمی کے سب سے بڑے میر تقی میر کل ہند اعزاز 31 ہزار روپے سے مشہور شاعر اور ادیب جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر خالد محمود کو سرفراز کیا ہے جبکہ اردو صحافت کا حکیم قمر الحسن کل ہند اعزاز (31 ہزار روپے)، ڈاکٹر رونق جمال (چھتیس گڑھ) کو شاداں اندوری کل ہند اعزاز (پندرہ ہزار روپے)، قاضی حسن رضا کو سراج میر خاں سحر صوبائی اعزاز (پندرہ ہزار روپے)، رشید اندوری (اندور) کو باسط بھوپالی صوبائی اعزاز (دس ہزار روپے)، کامل بہزادی (بھوپال) کو محمد علی تاج صوبائی اعزاز (دس ہزار روپے)، ان کے علاوہ تحقیق اور تنقید کے لیے مسٹر خالد عابدی (بھوپال) کو نواب صدیق حسن خاں صوبائی اعزاز (پندرہ ہزار روپے)، مسز وفا صدیقی (بھوپال) کو شعری بھوپالی صوبائی اعزاز (دس ہزار روپے)، تعلیمی خدمات کے لیے مسٹر صفدر رضا (کھرگون) کو کیف بھوپالی صوبائی اعزاز (دس ہزار روپے)، غیر اردو لسانی کے لیے مسٹر مدن موہن مشرا دانش (گوالیار)، کوشمبھو دیال سخن صوبائی اعزاز (دس ہزار روپے)، طنز ومزاح کے لیے ڈاکٹر شمع افروز زیدی (دہلی) کو جوہر قریشی کل ہند اعزاز (پندرہ ہزار روپے)، نئے تخلیق کاروں کے لیے مسٹر صابر صہبا (اندور) کو شفا گوالیاری صوبائی اعزاز (پانچ ہزار روپے) پیش کیے جائیں گے۔ یہ فیصلہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد (لکھنؤ) کی صدارت میں آج منعقد میٹنگ میں کیا گیا۔ میٹنگ میں ڈاکٹر بشیر بدر (چیئرمین اردو اکادمی)، جعفر بیگ (وائس چیئرمین، اردو اکادمی)، ڈاکٹر مظفر حنفی (دلی)، نسیم انصاری، رشید انجم، گووند آریہ نشاط، عارف عزیز (بھوپال)، طارق شاہین (اندور) اور محترمہ نصرت مہدی ممبر سکریٹری شریک تھے۔ **(ہمارا سماج، دہلی)**

ڈاکٹر بانو سرتاج کو مہاراشٹر گورنمنٹ کا ایوارڈ

● اردو، ہندی کی مشہور ادیبہ ماہر تعلیم اور سماج سیویکا ڈاکٹر بانو سرتاج کو گورنمنٹ آف مہاراشٹر کے مہیلا اور بال کلیان منترالیہ کی طرف سے پنیہ شلوک اہلیا بائی ہولکر ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔

2008-2007 کا یہ ایوارڈ بانو سرتاج کو ادب اطفال میں ان کی خدمات کے لیے دیا گیا ہے۔ ایوارڈ 10 ہزار نقد، شال اور سرٹیفکیٹ پر مشتمل ہے۔

(ڈاک سے)

طالب علم لقمان خان کو امریکی ایوارڈ

● جے پور۔ 3 فروری، راجستھان کی راجدھانی جے پور کے اگروال پی جی کالج کے تیسرے سال میں سائنس کے طالب علم لقمان خان کو آئندہ 14 اپریل کو نیویارک میں ''گلوبل ینگ انٹرپرینر آف دی ایئر ایوارڈ 2010'' دیا جائے گا۔ اس طالب علم نے سروس سنٹر کے توسط سے معمر شہریوں کے تجربات کا فائدہ اٹھانے کی انوکھی اسکیم بنا کر ملک بھر میں اول مقام حاصل کیا۔ غیر مقیم ہندوستانیوں کی تنظیم ''آئی کریٹ'' نے نیویارک میں واقع نیشنل فاؤنڈیشن آف ٹیچنگ انٹر پرینر شپ'' (این ایف ٹی آئی) کے تعاون سے

بنگلور میں قومی سطح پر بزنس پلان کی پیشکش کے مقابلے کا اہتمام کیا تھا۔ کالج میں اس مقابلے کی تیاری کے لیے قائم اپنا روزگار آپ ٹریننگ سنٹر کی انچارج آئی کریبٹ کی ایریا ٹریز ڈاکٹر انجا ننڈن کے مطابق این ایف ٹی آئی نے طالب علم لقمان خان کے دورے کا اہتمام کیا ہے۔ ایوارڈ کے طور پر توصیفی سند اور ایک ہزار ڈالر دیے جائیں گے۔ (صحافت، دہلی)

مختصرات

● بتیا۔ مرزا غالب کے یوم پیدائش کے موقع پر راج انٹر کالج، بتیا میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت پروفیسر زبیر احمد اور ڈاکٹر پرمیشور بھگت نے کی۔ نظامت کا فریضہ ڈاکٹر گورکھ پرساد مستانہ نے انجام دیا۔ مرزا غالب کی شاعری اور شخصیت پر تقریر کرتے ہوئے دیال سنگھ کالج دہلی میں اردو کے استاد ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کہا کہ غالب کی شاعری کی اہم خصوصیات ان کا تفکر اور انداز بیان کی جدت ہے۔ ابوظہیر ربانی نے مزید کہا کہ غالب نے نوآبادیاتی نظام کے اس دور میں ہوش سنبھالا جس میں ہر طرف انتشار اور بدنظمی کا دور دورہ تھا اور یہی بدنظمی 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی محرک بنی۔ اس جنگ میں ایک سلطنت کا خاتمہ ہی نہیں ہوا بلکہ ایک تہذیب کا بھی خاتمہ ہوگیا جس کی جیتی جاگتی علامت خود غالب تھے۔ لہٰذا غالب کی تفہیم کے لیے 1857 کے دور کو سمجھنا ضروری ہے۔ محمد مختار وفا، ایم شکیل اور ڈاکٹر ظفر امام نے بھی غالب کی حیات اور شاعری پر روشنی ڈالی۔ صدارتی تقریر میں پروفیسر زبیر احمد نے بتیا میں یوم غالب کی تقریب کی روایت کا ذکر کیا۔ بعد ازاں ایک مشاعرے اور کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا جس میں محمد مختار وفا، منظر سلطان، عبدالمجید خاں مجید، مرزا کھونچ، افتخار احمد کریک، ظفر امام، قمرالزماں قمر، کشوری لال انشو مالی، گورکھ پرساد مستانہ، سریش گپت، اختر حسین اختر، ایم شکیل اور آزاد اظہر وغیرہ نے اپنے کلام سے سامعین کو لطف اندوز کیا۔ (ڈاک سے)

● کانپور۔ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا میں ایک غیر ملک میں بشرطیکہ وہ ایک آزاد ملک ہو مرنے کو ترجیح دوں گا اور اگر آپ ہم کو ہندوستان میں آزادی نہیں دیں گے تو آپ کو مجھے یہاں ایک قبر دینی پڑے گی۔"

لندن کی گول میز کانفرنس میں 19 نومبر 1930 کو ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کے بنیادی مسائل پر مولانا محمد علی جوہر نے جو تاریخی تقریر کی اس کا ایک ایک لفظ ان کی قوت ایمانی اور حق گوئی کا مظہر تھا۔ اس تاریخی خطاب کے اختتام پر جب مولانا محمد علی جوہر نے مذکورہ عزم کا اظہار کیا تو ان کے یہ الفاظ ایک عالمی دھماکے کی صورت اختیار کر گئے جسے ساری دنیا نے حیرت سے سنا۔ وائسرائے کی طرف سے مولانا کو جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے دعوت نامہ ملا تو وہ بیمار تھے لیکن بیماری ان کے لیے عدم شرکت کا بہانہ نہ بنی۔ مولانا لندن پہنچ گئے اور کسی اسپتال یا نرسنگ ہوم میں داخلہ کے بجائے جس کا انھیں پروٹوکول کے تحت حق حاصل تھا سیدھے گول میز کانفرنس میں پہنچ گئے۔ جب مولانا کو تقریر کے لیے بلایا گیا تو پہلے انھوں نے کرسی پر بیٹھ کر تقریر شروع کی لیکن پھر جوش جذبات میں وہ کھڑے ہوگئے اور پر اثر اور مدلل خطاب کیا۔ قلیل ہی عرصہ گزرا تھا کہ انگریزوں کو برصغیر ہندو پاک کو آزاد کرنا پڑا لیکن مولانا محمد علی جوہر آزادی کا انتظار نہ کرسکے اور 4 جنوری 1931 کو صبح ساڑھے نو بجے مولانا کا انتقال ہوگیا۔ 5 جنوری کو 6 بجے شام ہیملا گن ٹاؤن ہال میں مولانا کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور 24 جنوری کو بیت المقدس میں سپرد خاک کیا گیا۔

مولانا کے 79ویں یوم وفات پر موومنٹ آف مسلم امپاورمنٹ نے ایصال ثواب اور خراج عقیدت کے لیے ایک خصوصی میٹنگ کا اہتمام کیا۔ اس تنظیم کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عشرت صدیقی نے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر نے مسلمانان برصغیر میں سیاسی شعور اور آزادی کی روح پیدا کرنے کے لیے جو لمبی لڑائی لڑی۔ کہیں ان کی پرجوش اور اثر انگیز خطابت نے مخالفین کے دل دہلا دیے تو کہیں ان کی تحریریں دشمنوں کے خرمن غرور پر بجلی بن کر گریں کبھی بحث و مباحثے کے ذریعے اپنے مدمقابل کے چھکے چھڑائے تو کبھی اپنے اشعار سے قوم کے لوگوں کے دلوں کو گرمایا۔

ممتاز حسین نے کہا کہ مولانا کے سینے میں ایک مرد مومن کا دل تھا۔ وہ حلقۂ یاراں میں ریشم کی طرح نرم ہوجاتے تو رزم حق و باطل میں فولاد کی طرح سخت تھے۔

ندیم شیخ نے کہا کہ مولانا نے آزادی کے لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن مصلحت پسندی کا شکار نہ ہوئے۔ اس موقع پر عقیل احمد، شکیل الرحمن، حافظ الیاس احمد، عظمت علی و دیگر نے خراج عقیدت پیش کیا۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● علی گڑھ۔ 18 جنوری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جنرل ایجوکیشن سینٹر کے لٹریری کلب کے زیر اہتمام مختلف موضوعات پر منعقدہ چھ روزہ ورکشاپ کی اختتامی اور سرٹیفکیٹ تقسیم کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یونیورسٹی کے میڈیا ایڈوائزر پروفیسر این اے کے درانی نے کہا کہ شخصیت سازی کے لیے طلبہ کو تعلیم کے ساتھ ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ جی ای سی کے زیر اہتمام طلبہ کی شخصیت سازی کے لیے جن چھ موضوعات کو ورکشاپ کے لیے منتخب کیا گیا وہ موجودہ نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہیں ان کی افادیت بھی مسلم ہے۔ انھوں نے طلبہ سے کہا کہ وہ مثبت تخلیقی عمل اور کورز پر بھی خصوصی توجہ دیں کیوں کہ غیر تدریسی سرگرمیاں انسان کو منفرد پہچان دلاتی ہیں۔ اعزازی مہمان یونیورسٹی لائبریرین پروفیسر شباہت حسین نے کہا کہ یونیورسٹی نے بھلے ہی بڑے سائنسداں پیدا نہ کیے ہوں لیکن ادبی و ثقافتی

میدان میں عالمی سطح کی شخصیات پیدا کی ہیں اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی علیگیرین کے طور پر دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم ہے۔ جنرل ایجوکیشن سینٹر کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر شکیل صمدانی نے کہا کہ یونیورسٹی لٹریری کلب کے زیرِ اہتمام منعقدہ چھ روزہ ورکشاپ کا انعقاد ان طلبہ و طالبات کے لیے کیا گیا جو لٹریری کلب کے اراکین نہیں ہیں لیکن اپنی شخصیت کو سنوارنا چاہتے ہیں۔ اس ورکشاپ کا مقصد طلبہ میں اسٹیج پر بولنے کی مہارت، گروپ ڈسکشن، مثبت تخلیقی عمل اور کوئز وغیرہ میں مہارت پیدا کرانا ہے۔ ڈاکٹر صمدانی نے بتایا کہ اس ورکشاپ کی خصوصیت یہ رہی کہ اس میں ''اردو اسپیکنگ اور اردو سے علی گڑھ کے رشتے'' پر یک روزہ ورکشاپ بھی کیا گیا۔ چھ روز تک چلے اس ورکشاپ میں چھ سو سے زائد طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔ ورکشاپ میں تمام شرکا کو سرٹیفکیٹ بھی عطا کیے گئے۔ اس موقع پر لٹریری کلب کے سکریٹری شاد احمد خاں نے رپورٹ پیش کرتے ہوئے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض مس غزالہ مہدی نے انجام دیے۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● ناگپور۔ وہ طلبہ جو ادب میں اپنی پہچان بنانا چاہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے اندر چھپی ہوئی فطری صلاحیتوں کو پہچانیں اور پھر مخصوص صنفِ ادب کا انتخاب کر کے طبع آزمائی کریں۔ اس خیال کا اظہار ڈاکٹر اشرف الدین ساحل نے مولانا ابوالکلام آزاد ہائی اسکول و جونیئر کالج میں منعقدہ، رائٹنگ ورکشاپ کے کلیدی خطبے میں طلبہ کو مختلف اصنافِ ادب سے متعارف کرواتے ہوئے کیا۔ جناب عبدالرؤف کی صدارت میں افتتاحی تقریب کا آغاز ایک طالب علم محمد مصطفےٰ نے تلاوتِ کلام ربانی سے کیا۔ ہائی اسکول و جونیئر کالج کے تقریباً دو سو طلبہ نے اس ورکشاپ میں شرکت کی۔ اس موقع پر بچوں کے معروف ادیب جناب وکیل نجیب نے طلبہ کو زیادہ سے زیادہ کتابوں اور رسائل کے مطالعے کا مشورہ دیا تاکہ وہ معیاری ادیبوں کے طرزِ تحریر اور مختلف اسالیب سے واقف ہوسکیں۔ میگزین تہذیب الکلام کے مہمان مدیر جناب شیخ محمد ہاشم نے ورکشاپ میں شریک طلبہ کو ڈائری لکھنے کی ترغیب دی تاکہ لکھنے کی مشق کے ساتھ عمدہ اقوال، اشعار اور ادیبوں کے افکار کا ذخیرہ بھی کرسکیں جو ان کے تخلیقی سفر میں معاون ثابت ہو۔ میگزین کے مدیر اور معروف انشائیہ نگار ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے طلبہ کو رسائل سے تحریریں نقل کر کے پیش کرنے یا چرا کر اپنے نام سے چھپوانے کی بری عادت سے دور رہ کر، آسان اور اپنی دلچسپی کے موضوعات پر لکھنے کا مشورہ دیا۔ جناب ضیاء اللہ خاں لودھی نے طلبہ کو سرورق کے ڈیزائن بنانے سے متعلق مفید ہدایات دیں۔ رسم شکریہ جناب رفعت انصاری نے انجام دی۔ جناب محمد ظہیر، جناب فیروز خاں پٹھان، جناب جاوید حسین، ڈاکٹر افروز جہاں، محترمہ رعنا انصاری، جناب مبین شیخ اور محمد ریاض نے اس ورکشاپ کو کامیابی سے ہمکنار کروانے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی۔ 17 جنوری، نئی نسل اور اردو کے موضوع پر دہلی یوتھ ویلفیئر ایسوسی ایشن کی جانب سے راجندر بھون میں منعقدہ ایک پروگرام سے ڈاکٹر فاروق نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کی اردو سے بے توجہی افسوسناک ہے۔ انھوں نے اردو کو آزادی کی زبان قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر اردو زبان نہ ہوتی تو ملک کو آزادی ملنا مشکل ہوجاتا، کیونکہ جہاں اردو نے سارے جہاں سے اچھا اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا وہیں اردو گنگا جمنی تہذیب کا اٹوٹ حصہ بن گئی۔ مسٹر فاروق نے کہا کہ اردو کی زبوں حالی کے لیے جہاں اہل اردو ذمے دار ہیں وہیں یہ میٹھی زبان حکومتوں کی بے توجہی کا شکار بھی رہی ہے۔ اس موقع پر ماسٹر صغیر احمد، ضیاء الحق سوز اور حکیم ایاز الدین ہاشمی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر نئی نسل کو اردو کے تئیں بیدار نہ کیا گیا تو یہ زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔ انھوں نے کہا کہ بلا شبہ ملک کی متعدد ریاستوں میں اردو دوسری زبان ہے، لیکن وہ کاغذوں تک ہی سمٹ کر رہ گئی ہے۔ مقررین نے زور دے کر کہا کہ آگے بھی اردو اور نئی نسل کے مابین تقابل کے لیے پروگراموں کے انعقاد کی بے حد ضرورت ہے۔ سوسائٹی کے صدر محمد نعیم نے کہا کہ انگلش میڈیم اسکولوں کے طلبہ کو بھی اردو سے واقف کرانے کی اشد ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر وقت نے ہمارا ساتھ دیا تو آنے والے دنوں میں وال سٹی کے اندر بھی ہم پرسنالٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کا انعقاد کریں گے۔ سوسائٹی کے جنرل سکریٹری سکندر مرزا چنگیزی نے سوسائٹی کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج سے 20 سال قبل یہ سوسائٹی غریبوں کی خدمت کے لیے بنی تھی، لیکن حالات بدلے اور اب یہ سوسائٹی صرف اور صرف ایجوکیشن پر دن رات کام کر رہی ہے۔ انھوں نے حکومت سے سوسائٹی کے لیے معقول جگہ اور فنڈ کی بھی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کے بغیر کام کرنا ناممکن ہے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

● امروہہ۔ ساحس ڈگری کالج نوگانواں سادات میں سال گذشتہ کی طرح امسال بھی ''جشن ساحس'' کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر ستیہ پی گوتم وائس چانسلر روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ مہمان خصوصی نے کہا کہ تعلیم انسان کو زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ انسان کی زندگی کا انداز منفرد ہوتا ہے۔ اس لیے نئی نسل کو تعلیم سے ہرگز غافل نہیں ہونا چاہیے۔ کالج کے طلبہ و طالبات نے ڈراما اور فینسی ڈریس میں علاقائی شو پیش کیے۔ جن کی حاضرین نے خوب حوصلہ افزائی کی۔

مہمان خصوصی کے ہاتھوں 2010 کے ''مینار علم ایوارڈ'' سے دانشوروں کو سرفراز کیا گیا۔ جن میں بیسٹ آرٹسٹ کا ایوارڈ مستجاب صدیقی کو دیا گیا۔ ڈاکٹر ناشر نقوی کو بیسٹ مقرر، اظہار عثمانی اور جے پال عادل کو بیسٹ کہانی کار، افسر امروہوی کو بیسٹ نعت گو، جنید اکرم فاروقی کو بیسٹ تنقید نگار، محترمہ قمر قدیر ارم کو بیسٹ شاعرہ، ندرت نواز کو بیسٹ شاعر، اختر نبی قریشی کو بیسٹ سوشل

ریفارمر، توفیق احمد چشتی کو بیسٹ ماہر نوادرات، ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی کو بیسٹ ایجوکیشنلسٹ اور بسنت سارسوت اور احمد مسیح الزماں کو بیسٹ صحافی ایوارڈ دیا گیا۔ کالج کے نگراں آل حسن انصاری نے صدارت کی جبکہ پروگرام کو محمد اسلم انصاری نے آرگنائز کیا۔ منیجر ندیم حسن انصاری نے سبھی حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ پرنسپل ڈاکٹر عبدالحق انجم نے نظامت کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● پٹنہ۔ 16 دسمبر، جنتا دل یو کے سینئر رہنما اور ہم ملت تنظیم کے قومی صدر ڈاکٹر پروفیسر آر آر کنوجیا نے نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری کے اس بیان کا خیر مقدم کیا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ مختلف حلقوں میں اردو کے لیے قومی سطح پر تحریک چلائی جائے۔ ڈاکٹر کنوجیا نے آج یہاں جاری بیان میں نائب صدر جمہوریہ کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک کے مختلف حلقوں میں اب تک اردو کو جتنی اہمیت کے ساتھ مقام ملنا چاہیے اتنا نہیں مل رہا ہے۔ جبکہ اردو کئی ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان ہے۔ ڈاکٹر کنوجیا نے کہا کہ کسی بھی زبان کے مکمل فروغ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس زبان میں دنیا کی مختلف زبانوں کے اچھے مضامین کا ترجمہ دستیاب ہو۔ لوگ مختلف زبانوں کے نقادوں، مصنفوں اور ترجمہ نگاروں کی تحریریں پڑھنے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

(ہمارا سماج، دہلی)

● ہزاری باغ۔ شعبۂ اردو ونوبا بھاوے یونیورسٹی کا شعبہ جاتی سیمینار حسب معمول منعقد ہوا جس کی صدارت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عامر مصطفیٰ صدیقی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے بوکارو اسٹیل سٹی کالج کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد اکرام اور صدر شعبۂ اردو پی کے رائے کالج دھنباد ڈاکٹر موصوف احمد نے شرکت فرمائی۔ سیمینار کی نظامت شعبۂ اردو کے فائنل ایر کی طالبہ غزالہ پروین نے کی مہمانوں کا تفصیلی تعارف استاد شعبہ ڈاکٹر زین رامش نے کرایا۔ سیمینار میں تین مقالے پڑھے گئے پہلا مقالہ سال دوئم کی طالبہ روشن نے اردو کی خواتین ناول نگار کے موضوع پر دوسرا مقالہ سال اول کے طالب علم تبریز احمد نے پریم چند کی افسانہ نگاری کے کچھ اہم پہلو کے موضوع پر اور تیسرا مقالہ سال اول کی طالبہ رفعت انجم نے کفن ایک جائزہ کے موضوع پر پیش کیا۔ سبھی مقالوں پر گفتگو ہوئی جس میں طلبہ وطالبات نے سوالات کیے اور اساتذہ نے مقالوں کا جائزہ لیا ڈاکٹر زین رامش نے تفصیل کے ساتھ ان مقالوں کا جائزہ لیا اور طلبہ وطالبات کے قائم کردہ سوالوں کا جواب دیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● اقبال اکادمی، الٰہ آباد کے زیر اہتمام ایک ادبی محفل جناب شاہ محمود احمد رمزی کی رہائش پر آراستہ ہوئی۔ اس محفل میں پروفیسر علی احمد فاطمی نے ''اقبال اور الٰہ آباد'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اقبال کے سفر الٰہ آباد (1930) پر بطور خاص گفتگو کی اور واضح کیا کہ اقبال کو پاکستان کا نظریہ ساز قرار دینا غلط ہے۔ اقبال نے خطبۂ الٰہ آباد میں شمال مغرب میں ایک مسلم ریاست کے قیام کی بات کہی تھی جس میں مسلمانانِ ہند اپنے تہذیبی تشخص اور مذہبی اقدار کی حفاظت کر سکیں، اس کو فروغ دے سکیں اور اس کے مطابق آزادانہ زندگی گزار سکیں۔ قیام پاکستان کے بعد بعض ناقدین نے اس کی غلط تشریح اور تشہیر کی اور اس بات کو عام کرنے کی کوشش کی کہ اقبال نے تصور پاکستان پیش کیا۔ پروفیسر فاطمی نے اقبال کے سفر الٰہ آباد کی تفصیلی روداد پیش کی، الٰہ آباد اسٹیشن پر اقبال کے پر جوش استقبال، نواب یوسف کی رہائش گاہ پر ان کے قیام، دوازدہ منزل (جہاں اقبال نے خطبہ دیا تھا) کے حالات و واقعات کو خوبصورتی سے پیش کیا۔ صدارتی تقریر میں پروفیسر سید محمد عقیل نے بھی اس بات کی تائید کی کہ اقبال کو پاکستان کا نظریہ ساز قرار دینا اقبال پر تہمت ہے۔ انھوں نے صرف مسلم ریاست کی بات کہی تھی اسلامی مملکت کی نہیں۔ محفل میں یوپی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ایس ایم اے کاظمی، پروفیسر عبدالقادر جعفری، تحسین عثمانی، ڈاکٹر فخر الکریم، ڈاکٹر حسنین اختر، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر فاضل ہاشمی، ڈاکٹر عزیزہ بانو، ڈاکٹر صالحہ زرین، عبدالحی، شاہنواز عالم وغیرہ نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

● گذشتہ دنوں احمد آباد میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی اشتراک سے دی اکھل بھارتیہ سد بھاؤنا ٹرسٹ احمد آباد کے زیرِ اہتمام یک روزہ سیمینار بعنوان ''ولی گجراتی— فن اور شخصیت'' کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کی ابتدا دی اکھل بھارتیہ سد بھاؤنا ٹرسٹ کے صدر جناب شبیر ہاشمی نے کی۔ انھوں نے سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون کا شکریہ بھی ادا کیا۔

اجلاسِ اوّل کے صدر پروفیسر محی الدین ممبئی والا نے کہا کہ ہم مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کے مشکور ہیں کہ انھوں نے 17ویں صدی کے کلاسیکل شاعر اور جدید غزل کے بانی ولی کو ادبی دنیا سے متعارف کرایا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ولی کے فن پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ہماری نئی نسل کو آگے آنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ پروفیسر محی الدین ممبئی والا نے اجلاسِ اوّل میں پڑھے گئے مقالوں کی ستائش کی۔

اجلاسِ دوم کی صدارت ڈاکٹر انور ظہیر نے کی۔ ڈاکٹر انور ظہیر نے اپنے خطبے کے دوران اجلاسِ دوم کے مقالوں کا تنقیدی جائزہ لیا اور ولی کے فن پر ہنوز تحقیق کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کے علاوہ پروفیسر نثار احمد انصاری اور پروفیسر وجیہہ الدین نے بھی اظہار خیال کیا۔ نیز اس بات پر زور دیا گیا کہ اب ولی کی وطنیت کا معاملہ خارج از بحث ہو چکا ہے کہ ولی، گجراتی تھے، دکنی تھے یا اورنگ آبادی تھے۔ ولی جدید غزل کے بانی ہیں اور انھیں اسی زاویے سے دیکھنا چاہیے۔ سیمینار میں جناب ندیم انصاری، ڈاکٹر مسیح الزماں انصاری، جناب غلام

محمد انصاری، پروفیسر ناظمہ انصاری، ڈاکٹر وجیہہ الدین، جناب ابہام رشید، جناب وفا جون پوری، جناب شفاعت قادری اور جناب امیر بن نیاز نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ سامعین کا تاثر اور تعاون بھی بہت اچھا رہا۔
(ڈاک سے)

● جودھپور۔ ''غالب نے فلسفے کو فن بنا دیا۔ وہ ہندوستان کے پہلے جدید شاعر ہیں جنھوں نے ہماری تہذیب اور اقدار کو غزل میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔'' ان خیالات کا اظہار شین کاف نظام نے بزم اردو اور سروکار کے زیرِ اہتمام مرزا غالب کے 212 ویں یوم پیدائش کے موقع پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ غالب ہمہ گیر شاعر ہیں جن کے کلام کی وسعت کا احاطہ کرنا نہایت مشکل ہے۔ راجستھان اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین اے. ڈی. راہی نے کہا کہ غالب نے اپنی راہ خود نکالی۔ انھوں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔ شہر خطیب اور پیش امام قاضی محمد ایوب انصاری نے غالب کے حالاتِ زندگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ غالب پر اتنی تحقیق کے باوجود ابھی بہت کام باقی ہے۔

اس موقع پر مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا جس کی صدارت منظر القادری نے کی۔ مشاعرے میں شین کاف نظام، ڈاکٹر فرید آفریدی، اے. ڈی. راہی، کرپا شنکر رندی، حبیب کیفی، ساغر القادری، اقبال کیف، سرفراز شاکر، شین میم حنیف، ڈاکٹر نثار راہی، محمد افضل جودھپوری، اشراق الاسلام ماہر، برجیش عنبر، رئیس جودھپوری اور امیش ساحل نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ آخر میں اشراق الاسلام ماہر نے شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نثار راہی نے انجام دیے۔
(ڈاک سے)

● سرسید احمد خان پبلک لائبریری مصطفیٰ آباد (چوپڑا) ضلع جلگاؤں کے زیرِ اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے مالی تعاون سے 2 جنوری اور 3 جنوری 2010 دو روزہ سیمینار بعنوان ''غالب فن اور شخصیت'' منعقد ہوا۔ 2 جنوری کو سیمینار کا افتتاح جناب عبدالمجید ذکریا کے ہاتھوں ہوا۔ مقالہ نگار اور مہمانِ خصوصی کی گلپوشی کے بعد لائبریری کے نائب صدر فاروق سر نے ابتدائی کلمات پیش کیے بعد ازاں خاندیش کے معروف قلم کار جناب رحیم رضا نے اپنا مقالہ پیش کیا اور کلام غالب کی خوبیوں پر روشنی ڈالی۔ جناب قیوم راز نے غالب کے کلام میں صوفیانہ میلانات پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ایم آئی ساجد نے غالب اور کلامِ اردو کے موضوع پر مقالہ پیش کیا خاندیش کے بزرگ افسانہ نگار احمد کلیم فیض پوری نے ''خطوطِ غالب'' پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی اور سامعین نے خوب داد دی۔ صدرِ جلسہ الحاج کریم سالار صاحب نے ان مقالوں کو کتابی شکل میں پیش کرنے کے لیے عبدالمجید ذکریا اور اپنے تعاون کا وعدہ کیا۔

3 جنوری اتوار کو انجمن تعلیم المسلمین کے صدر الحاج عبدالغفار ملک کی صدارت میں سیمینار کا آغاز جناب رحیم رضا کے ہاتھوں ہوا مہمانوں کی گلپوشی کے بعد جناب سید ذاکر علی نے ''معاصرین مرزا غالب'' پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ہفت روزہ خیر آندیش مالیگاؤں کے مدیر جناب خیال انصاری نے غالب کی عشقیہ شاعری کے موضوع پر مقالہ پیش کیا آخر میں بزرگ شاعر ڈاکٹر محبوب راہی نے ''غالب عصر حاضر کا شاعر'' جیسے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ صدر جلسہ نے تمام قلم کاروں اور خصوصاً رحیم رضا کو مبارکباد دیتے ہوئے چوپڑا جیسے مقام پر غالب کے فن اور شخصیت جیسے موضوع پر کامیاب سیمینار کے انعقاد کے لیے تعریف کی۔ لائبریری کے صدر انیس محشری، فاروق شیخ، توصیف محشری نے خوب محنت کی اور پروگرام کو کامیاب بنایا۔ فاروق سر نے شکریہ ادا کیا اس دو روزہ سیمینار کی نظامت جناب کاتب نعیم نے بحسن و خوبی انجام دی۔ جناب سلیم خان فیض پوری، الحاج انصار احمد بھساول، سلیم معصوم رکن اکادی مہاراشٹر چراغ سیٹھ قاضی مجیب احمد، عمران انصاری وغیرہ بحیثیت مہمانِ خصوصی شریک تھے۔
(ڈاک سے)

● ریاست مہاراشٹر کی گولڈن جوبلی تقریبات کے موقع پر مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادی اور ڈائرکٹوریٹ برائے ثقافت حکومت مہاراشٹر کے زیر اہتمام ایک ریاستی مشاعرہ سنیچر مورخہ 23 جنوری 2010 کی شب رویندر ناٹیہ مندر، ممبئی میں منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کا افتتاح اردو اکادی کے کارگزار صدر پروفیسر عبدالستار دلوی نے کیا۔ جناب نندکمار پاٹل نے ریاست مہاراشٹر کی گولڈن جوبلی تقریبات کے پروگراموں کی تفصیل بیان کی۔ ندا فاضلی، ممتاز راشد، شمس جالنوی، مدحت الاختر، عبدالاحد ساز، ابراہیم اشک، رفیق جعفر، ایس. ایس. سدھو اجنبی، اشفاق مارولوی، سراج سولاپوری اور محترمہ قمر سرور نے اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرے کی صدارت جناب بشر نواز نے کی۔ اردو اکادی کے ممبر سکریٹری ڈاکٹر قاسم امام نے مشاعرے کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ وقار قادری ایگزیکیوٹیو آفیسر اردو اکادی کے شکریے پر مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔
(ڈاک سے)

رسمِ اجرا

اور اس وقت

● آوارگانِ ادب، کلکتہ کی جانب سے معروف افسانہ نگار و مترجم جناب شبیر احمد کی کتاب ''اور اس وقت'' کی تقریب رونمائی 15 جنوری 2010 بروز جمعہ شام چھ بجے منعقد ہوئی۔ بزرگ شاعر حضرت قیصر شمیم کو مسندِ صدارت پر بٹھایا گیا۔ پروفیسر اختر الواسع (صدر شعبہ، اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ (ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)، جناب نند کشور وکرم (مدیر عالمی ادب، نئی دہلی)، جناب بیدار بخت صدیقی (IAS)، مہمانانِ اعزازی بنائے گئے جبکہ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

جناب شمشیر عالم زاہد نے تقریب کا افتتاح کیا، جبکہ رسم رونمائی کا فریضہ ڈاکٹر اسد رضا نے انجام دیا۔ دوسرے درجے کی تخلیق سے بہتر ہے کہ دوسری زبانوں سے پہلے درجے کی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ نالائق بچہ پیدا کرنے سے اچھا ہے کہ کسی لائق بچے کو گود لے لیا جائے۔ جناب شمشیر عالم زاہد نے اصل کتاب ''سے ای سے'' اور اس کے مصنف جناب سنیل گنگوپادھیائے (چیئرمین، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی) کے بارے میں سیر حاصل گفتگو کی اور اس کا تقابل قرۃ العین کے ناول آخرِ شب کے ہمسفر سے کیا۔ شری امرمترا نے سنیل گنگوپادھیائے کے فن اور شخصیت پر مدلل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ شبیر احمد نے بنگلہ کے اتنے معتبر ادیب و شاعر کی کتاب کو اردو والوں کو پڑھنے کا موقع فراہم کیا واقعی وہ اس کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جناب مشتاق انجم نے شبیر احمد کی ادبی سرگرمیوں کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس سے پہلے بھی انھوں نے بنگلہ کے ایک عظیم شاعر سبھاش مکھوپادھیائے کے مجموعۂ کلام ''جو تو دورے ای جائی'' کو ''چلتے چلتے'' کے نام سے اردو کے قالب میں بڑی خوبصورتی سے ڈھالا ہے، بنگلہ کے ایک بڑے شاعر نیرندرناتھ چکرورتی کے ''النگوراجا'' کو بھی ''شاہِ بےلباس'' کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ صلح الدین پرویز کے ناول ''آئیڈنٹیٹی کارڈ'' کو بنگلہ میں منتقل کر کے اہل ادب کو چونکایا ہے اور اب چھ سو اسی صفحات پر مشتمل ''اور اس وقت'' کے نام سے انھوں یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ جناب ایم علی نے کہا کہ ترجمہ کے میدان میں ان کی آمد ایک روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ یہ بات کہ ترجمہ نگاروں کو تخلیق کاروں پر کبھی فوقیت حاصل نہیں ہوسکتی اب قصۂ پارینہ ہے۔ اس موٹی ضخیم اور دستاویزی کتاب کا جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے کہیں بھی اکتا دینے والی کیفیت پیدا نہیں ہوئی، بلکہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کتاب اول اول بنگلہ میں نہیں بلکہ اردو ہی میں لکھی گئی ہے، یہ مترجم کی کامیابی کی دلیل ہے۔ آخر میں صدر جلسہ حضرت قیصر شمیم نے تمام مقررین کی گفتگو کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ شبیر احمد کا یہ کارنامہ واقعی لائق ستائش ہے۔ اس کے بعد آوارگانِ ادب کے سکریٹری اور خوش فکر شاعر جناب فراغ روہوی نے مقررین اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

غلط پتہ

● ممبئی۔ ''اردو خبرنامہ'' کے زیر اہتمام افسانہ نگار م۔ ناگ کے دوسرے افسانوی مجموعے ''غلط پتہ'' کے اجرا کی تقریب سنیچر 16 جنوری 2010 کی شام کو ہوئی۔ تقریب کی صدارت ندا فاضلی نے کی، رسم اجرا ساجد رشید کے ہاتھوں انجام پائی جبکہ نظامت کے فرائض الیاس شوقی نے انجام دیے۔ اس تقریب میں سلام بن رزّاق، انور قمر، مقدر حمید، عالم ندوی، اسلم خان اور نیر حسن نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اسلم خان نے م۔ناگ کے افسانوں کی ساخت اور بُنت کے بارے میں بتایا کہ م۔ناگ کے یہاں بے باکی، بے ساختگی اور اظہار کی شدّت ہے اور یہ جوہر انھیں مراٹھی افسانے سے حاصل ہوا ہے جس کا انھوں نے کافی مطالعہ کیا ہے۔ عالم ندوی نے ایک خاکہ پڑھا جس میں م۔ناگ کے چند افسانوں کے نسوانی کرداروں کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے افسانہ نگار کے روزمرّہ سے جوڑا۔ ساجد رشید نے کہا کہ م۔ناگ اپنے تمام معاصرین سے مختلف ہیں ان کے یہاں غضب کی بے ساختگی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں پیچیدہ کرداروں کو ایسے بیان کر جاتے ہیں کہ لفظ متحرک معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں طنز نہ تو تلخی میں بدلتا ہے اور نہ ہی ناصحانہ لہجہ اختیار کرتا ہے۔ مقدر حمید نے کہا کہ ناگ حساس افسانہ نگار ہیں، موضوعات کو برتنے کا ڈھنگ ان کا اپنا ہے وہ اپنی طرح کے واحد افسانہ نگار ہیں۔ انور قمر نے پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی کہانی ''عینک والا آدمی اور اس کی بیوی'' 1975 میں ہم دوستوں نے حفیظ آتش کے مکان پر سنی تھی اور متاثر ہوئے تھے۔ انور قمر نے ''بگ بینگ'' اور'' میں خیال ہوں کسی اور کا'' ان دو افسانوں کا مختصر تجزیہ کیا اور کہا کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں علامتیں استعمال کی ہیں اور استعارے بھی۔ سلام بن رزّاق نے م۔ناگ کے چند افسانوں ''بچپن، آدم اور حوا، تیرتھ اور میں خیال ہوں کسی اور کا'' ذکر کرتے ہوئے کہا کہ م۔ناگ کی تحریریں ان کی شناخت ہیں، شوخی اور طنز ان کی تحریر کا خاصہ ہے۔ ندا فاضلی نے اپنے صدارتی دور میں کہا'' م۔ناگ کا نام اس لیے اہم ہے کہ وہ موضوعات کے انتخاب کے ساتھ اپنی لفظیات سے قارئین میں پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی کہانیاں ہمارے عہد کے مسائل کا سامنا کرتی ہیں او ران کا لسانی رویہ بھی متوجہ کرتا ہے۔''

تقریب کے مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر شیخ عبداللہ اور ماسٹر وسیم الدین اعظمی تھے اور کنوینر رمضان علی سحر تھے۔ آخر میں ''اردو خبرنامہ'' کے ایڈیٹر اشتیاق سعید نے تمام شرکا، مہمانان، سامعین کے علاوہ انجمن خیرالاسلام کے پرنسپل نذیر الحسن اور انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

عکس تاب

● 13 دسمبر کو مسلم انسٹی ٹیوٹ لٹریری کمیٹی کے زیر اہتمام ڈاکٹر معصوم شرقی کے شعری مجموعے ''عکس تاب'' کی رونمائی ف۔س۔اعجاز کے ہاتھوں ہوئی۔ ناظم جلسہ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے صاحب کتاب اور ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے تعارفی کلمات ادا کیے۔ جناب انجم عظیم آبادی نے جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے 50ء کے بعد غزل کے رنگ و آہنگ میں ہونے والی تبدیلیوں پر گفتگو کی اور کہا کہ ''عکس تاب'' میں درجنوں اشعار ایسے مل جائیں

گے جو قارئین کو متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ف.س.اعجاز نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس کتاب کے آنے سے مجھے اس لیے بھی خوشی ہوئی کہ میں ان سے اصرار کرتا رہا تھا کہ وہ اپنا مجموعۂ غزلیات شائع کریں۔ ظہیر انور نے کہا کہ غزل میں اپنی آواز کا جادو جگانا بڑا کام ہے۔ معصوم شرقی کی غزلوں کی عمومی فضا ترقی پسندانہ ہے لیکن ان کی غزلیں برہنہ گفتاری سے بچ گئی ہیں۔ ڈاکٹر شمیم انور نے کہا کہ ان کی شاعری کلاسیکیت، جدیدیت اور رومانیت سے عبارت ہے۔ انیس رفیع نے کہا کہ عکس تاب بہت خوبصورت نام اور انوکھی ترکیب ہے۔ معصوم نے شعری زمینوں میں غنائی اور موسیقیت پیدا کی ہے۔ نثار وارث نے کہا کہ عصری تقاضوں اور محسوسات کو شعری قالب میں ڈھالا جائے تو سامعین یا قارئین ایسی شاعری سے یقیناً متاثر ہوں گے۔ یہ باتیں معصوم شرقی کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔

پروفیسر سلیمان خورشید نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ جدیدیت، ترقی پسندی، مابعد جدیدیت جیسے ادبی ازم سے خود کو دور رکھتے ہوئے معصوم شرقی نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ ہم تبدیلیوں اور ارتقائی منزلوں سے گزر رہے ہیں جو تخلیقی صلاحیت رکھنے والوں کو اظہار کی دعوت دیتی ہیں۔ بظاہر دنیا ترقی کررہی ہے لیکن اس میں تنزلی بھی پنہاں رہتی ہے۔ اس تناظر میں معصوم کے اشعار میں لطیف طنز کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔ بعض اشعار میں رجزیت کا اظہار بھی ہوا ہے جس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں اگر کہیں اکہرا پن ہے تو تہہ داریاں بھی نظر آتی ہیں۔ (آبشار، کلکتہ)

تکلم

● نئی دہلی۔ آل انڈیا رفاہ عام فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منڈاولی فاضل پور کے نیرولا میں اردو کے بزرگ شاعر نیر قریشی گنگوہی کے شعری مجموعے ''تکلم'' کا اجرا ڈاکٹر شباب للت کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ڈاکٹر شباب للت نے کہا کہ نیر قریشی ایک لمبے عرصے سے شعروادب کی بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس عہد میں اچھے ادب کی تخلیق کرنا ایک نئے معاشرے کی تشکیل دینے کے مترادف ہے۔ اس موقع پر ایک مشاعرے کا بھی انعقاد ہوا جس کی صدارت مخمور سعیدی نے کی اور مہمان خصوصی ڈاکٹر یونس غازی رہے۔ نظامت مشہور افسانہ نگار اقبال انصاری نے کی۔ مشاعرے کے کنوینر عمران عظیم ایڈوکیٹ اور قاری محمد فیضان جامعی تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

آتش زیرپا

● بھوپال۔ شاعری کی قدیم روایات کی پاسداری، ترقی پسند رجحانات سے آگاہی اور جدید حسیت کے ساتھ معاشرے اور سماج کے سلگتے ہوئے مسائل کی موجودگی شاعری اور شاعر دونوں کی بہتری کی دلیل ہے اور اس کسوٹی پر ظفر صہبائی کی شاعری نہ صرف پوری اترتی ہے بلکہ ان کی ادبی شخصیت کو ان کے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر آفاق احمد نے دانشوروں کے ادبی اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ بزم خوشبو کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں پروفیسر آفاق احمد، ظفر صہبائی کے تازہ مجموعۂ کلام ''آتش زیرپا'' کی رسم اجرا کی تقریب کی صدارت کررہے تھے۔ تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے عشرت قادری نے شرکت کی۔ انور حسین انور، اقبال مسعود، عارف عزیز، ضیا فاروقی، مختار شمیم، پروفیسر عبدالمجید، خلیل اللہ خاں ایڈوکیٹ وغیرہ نے اظہار خیال کیا۔ تقریب کے دوسرے دور میں بزم خوشبو کی طرف سے ''فخر خوشبو'' ایوارڈ سے پروفیسر آفاق احمد کو نوازا گیا۔ آخر میں مشاعرے کا بھی اہتمام کیا گیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

پنجرے کا آدمی

● رونق جمال کے افسانوں کے پانچویں مجموعے ''پنجرے کا آدمی'' کا اجرا 29 دسمبر 2009 کو ہوا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے کی۔ مہمان خصوصی وکیل نجیب صاحب تھے اور مہمان خاص غلام رسول اشرف۔ تقریب کی نظامت کے فرائض جناب ڈاکٹر ایم آئی ساجد نے انجام دیے۔ رونق جمال نے چھتیس گڑھ صوبے کے ادبا و شعرا کے استقبال میں مختصر تقریر کی اور مائیک ناظم جلسہ ڈاکٹر ساجد کو سونپ دیا۔ انجمن ترقی اردو ہند شاخ درگ بھلائی کی جانب سے رونق جمال کو شال اور پھولوں کا ہار پیش کیا گیا۔ ''پنجرے کا آدمی'' کی رونمائی جناب وکیل نجیب نے کی۔ غلام رسول اشرف صاحب نے رونق جمال کو ایک کامیاب قلمکار بتایا۔ ایم آئی ساجد صاحب نے رونق جمال کے ابتدائی ادبی سفر کی جھلکیاں پیش کیں۔ جناب شرف الدین ساحل نے کہا کہ رونق جمال کی کہانیوں میں سماج کی تصویر ہوتی ہے۔ سماج کا درد ہوتا ہے۔ کڑوا سچ ہوتا ہے، سبق ہوتا ہے۔ رہنمائی ہوتی ہے۔ غریبی سیاست اور ضمیر پر چوٹ ہوتی ہے۔ مہمانوں کی فرمائش پر رونق جمال نے کہانی ''اور بجوکا شہید ہوگیا'' سنائی تو سامعین کی آنکھیں نم ہوگئیں جس پر ساحل صاحب نے کہا کہ میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں رونق جمال کے قلم کا جادو دیکھ رہا ہوں۔

(ڈاک سے)

جمال ہم نشیں

● گذشتہ 3 جنوری 2010 کو بھونیشور ہوٹل اشوکا کلنگا میں منعقدہ ایک غیر رسمی ادبی تقریب میں اردو کے شاعر جناب خالد رحیم کے پانچویں شعری مجموعے ''جمال ہم نشیں'' کا اجرا عالمی شہرت یافتہ شاعر پروفیسر شہریار کے ہاتھوں عمل میں آیا ہے۔ ''جمال ہم نشیں'' اردو کے نامور شعرا کی غزلوں پر تضمین کی شکل میں خالد رحیم کی شاعرانہ ہنرمندیوں کے ارتکاز کا جیتا جاگتا

نمونہ ہے۔ پروفیسر شہریار کے علاوہ اردو کے نامور تنقید نگار و شاعر پروفیسر کرامت علی کرامت اور دوسری متعدد ادبی شخصیتیں شریک محفل تھیں۔ پروفیسر کرامت علی کرامت نے اپنے تاثراتی بیان میں کہا کہ خالد رحیم اڑیسہ کے اولین شاعر ہیں جنھوں نے مشاہیر شعرا کی غزلوں پر بے ساختہ تضمین کی او رانھیں کتابی شکل میں دیدہ ورقارئین کی نذر کیا۔ (ڈاک سے)

جنگل میں دنگل

● اکولہ۔ معروف افسانہ نگار اور بچوں کے ادیب محمد رفیع الدین مجاہد کی بچوں کے لیے تحریر کردہ کہانیوں کے تازہ ترین مجموعے ''جنگل میں دنگل'' کا اجرا حال ہی میں عمل میں آیا۔ بتقریب بارسی ٹاکلی میں ڈاکٹر محبوب راہی کے دولت کدے پر ہوئی۔ جس کی صدارت محمد رفیق ندوی المعروف شاد اکولوی نے فرمائی۔ اجرا کی رسم ڈاکٹر محبوب راہی کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ ڈاکٹر محبوب راہی اور قاضی رؤف انجم نے رفیع الدین مجاہد کی تخلیقی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں علاقے کے ابھرتے ہوئے نثر نگاروں میں سر فہرست قرار دیا۔ ان کے افسانے اور بچوں کے لیے کہانیاں ملک کے مقتدر ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ شرکائے محفل میں غلام عارف، ڈاکٹر محمد ذاکر نعمانی، امان الحق، ساجد محشر اور ظہیر احمد ظہیر نے اس نئی کتاب کی اشاعت پر مجاہد کو مبارک باد پیش کی۔ محمد رفیق ندوی شاد اکولوی نے اپنی صدارتی تقریر میں بچوں کے ادب کی افادیت واہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ''جنگل میں دنگل'' کو ایک اہم ضرورت کی تکمیل قرار دیا اور مجاہد کو اس کے لیے مبارک باد پیش کی۔ رفیع الدین مجاہد کے شکریے پر اس محفل کا اختتام عمل میں آیا۔ (ڈاک سے)

نشانِ تعلیم

آمبور۔ مولانا آزاد ایجوکیشنل اکادمی کے زیر اہتمام ''نشانِ تعلیم'' کا اجرا ہوا۔ حافظ رحمت اللہ صاحب نے قرأت کلام پاک سے جلسے کا آغاز کیا۔ حافظ سید محمد شریف صاحب نے جلسے کی صدارت فرمائی اور اپنے دستِ مبارک سے نشانِ تعلیم کا اجرا فرمایا۔ رسالے کی پہلی کاپی مہمانِ خصوصی جناب واؤ رنذیر احمد کی خدمت میں آپ نے پیش کی۔ صدر صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ شہر آمبور میں تعلیم کے ایک معلوماتی پرچے کا افتتاح ایک نیک فال ہے۔ مہمانِ خصوصی نے مشورہ دیا کہ یہ تعلیمی رسالہ مفت تقسیم کرنے کے بجائے مناسب قیمت پر قارئین کو فراہم کیا جائے جس کی تائید صدر صاحب نے بھی کی۔ جناب فضل اللہ صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ نشانِ تعلیم کے مدیر جناب بی۔ اشرف علی صاحب نے سالانہ رپورٹ پیش کی۔ (ڈاک سے)

آئینوں کے درمیاں

● سنبھل۔ نظام سنبھلی کے مجموعۂ کلام ''آئینوں کے درمیاں'' کا اجرا ماہر تعلیم حماد احمد ایڈووکیٹ کے ہاتھوں عاشق پبلک لائبریری سنبھل میں عمل میں آیا۔ تقریب کا آغاز انتخاب سنبھلی کی پیش کردہ حمد باری تعالیٰ سے ہوا۔ شہر صدر کانگریس اشرف سیفی ایڈووکیٹ او رمقبول سیٹ نے شمع روشن کی۔ صدارت عبدالرحمٰن ایڈووکیٹ اور نظامت رضوان مسرور نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر نسیم اظفر باقری، طارق قمر، ڈاکٹر منور تابش، طاہر رزّاقی، سلطان خاں کلیم، عاطر سنبھلی، میر شاہ حسین، موحد حسین طلعت، افروز احمد اور فرقان سنبھلی موجود تھے۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

وفیات

موہن چراغی

● نئی دہلی۔ 2 فروری، بزرگ اردو صحافی موہن چراغی کا 71 سال کی عمر میں کل رات کلکتہ میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا قومی آواز کے ایڈیٹر موہن چراغی کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ اور دو بیٹیاں ہیں۔ وہ سابق وزیر اعظم پی وی نرسمہاراؤ کی حکومت کے دوران قومی یکجہتی کونسل کے ممبر رہے چراغی پچھلے ایک سال سے گردے کی تکلیف کے لیے زیر علاج تھے۔ انھوں نے کشمیری سیاست سے متعلق ایک کتاب ''برف میں آگ'' تصنیف کی تھی۔ انھیں فرقہ وارانہ ہم آہنگی ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ جموں وکشمیر کے گورنر این این ووہرا اور وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ نے ان کے انتقال پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا اور انھیں آزادی رائے کا نقیب قرار دیا۔ موہن چراغی نامور صحافی شمیم احمد شمیم کے ساتھ روزنامہ ''آئینہ'' سے بھی وابستہ رہے تھے اور کچھ عرصے جموں و کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ مرحوم میر قاسم کے سکریٹریٹ میں پی آر او کے فرائض بھی انجام دیے۔ انھوں نے سری نگر میں اپنے قیام کے دوران ''نیشنل ہیرالڈ'' کے لیے بھی صحافتی فرائض انجام دیے اس کے بعد وہ دہلی منتقل ہوگئے اور بزرگ اردو صحافی عشرت صدیقی کی سرپرستی میں دہلی سے شائع ہونے والے روزنامہ قومی آواز کی ایڈیٹر شپ کے فرائض انجام دیے اور وہ اس منصب پر 30 اپریل 2008 تک فائز رہے۔

محمود ایوبی

● ممبئی۔ 27 جنوری، سرکردہ اردو صحافی اور ادیب محمود ایوبی کا آج یہاں انتقال ہوگیا۔ وہ 71 برس کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ جوگیشوری علاقے کے اوشیوارہ مسلم قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ جنازے میں عزیز واقارب کے علاوہ بڑی تعداد میں ادبا و شعرا نے شرکت کی۔ 10 فروری 1939 کو مونگیر میں پیدا ہونے والے محمود ایوبی نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کلکتے میں روزنامے آزاد ہند، اخوت اور سنگم سے کیا۔ اس شہر کی دو

اہم درس گاہوں پریسیڈنسی مسلم ہائی اسکول اور سی ایم او ہائی اسکول میں انھوں نے درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ ممبئی میں روزنامہ ہندوستان اور اردو ٹائمز کے علاوہ ہفت روزہ ''بلٹز'' میں صحافتی نقوش چھوڑنے والے مرحوم صحافی ادبی حلقوں میں اپنی خوش مزاجی کے لیے کافی مشہور تھے۔ ان کے افسانے ''جنازہ''، ''پری کتھا'' اور ''دوسری مخلوق'' نے کافی پذیرائی حاصل کی تھی۔ انھیں کئی ایوارڈ اور انعامات سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ حال ہی میں بھیونڈی کے ایک رسالے نے ان کی افسانوی خدمات پر ایک خصوصی ضمیمہ بھی نکالا تھا۔ محمود ایوبی سہ ماہی نیا ورق سے بھی وابستہ رہے اور مراٹھی زبان کے مشہور اخبار مہانگر کے اردو ایڈیشن کی بھی انھوں نے ادارت کی تھی۔

محفوظ الرحمٰن

● نئی دہلی۔ معروف کہنہ مشق صحافی محفوظ الرحمٰن کا آج صبح انتقال ہوگیا۔ وہ 75 سال کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ، 2 بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ مرحوم صوم وصلاۃ کے پابند، خوش اخلاق، ملنسار اور انتہائی نامساعد حالات میں بھی اپنے اصولوں پر قائم رہنے والے انسان تھے۔ ان کی تدفین بعد نماز مغرب دہلی گیٹ قبرستان میں عمل میں آئی۔ اعظم گڑھ نوناری گاؤں میں پیدا ہوئے محفوظ الرحمٰن نے مسلم مجلس مشاورت کے اخبار قائد سے اپنا صحافتی کیریئر شروع کیا تھا۔ وہ مجلس کے جوائنٹ سکریٹری بھی رہے۔ دہلی آنے کے بعد سہ روزہ دعوت سے وابستہ ہوگئے اور طویل عرصے تک اس کی ادارت کی ذمے داری سنبھالی۔ ممبئی قیام کے دوران ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمس سے بھی وابستہ رہے۔ اپنا ہفت روزہ اخبار جمعہ، پندرہ روزہ بادبان بھی نکالا۔ پولینڈ اور روس کے سفارتخانے میں بطور مترجم کام کیا۔ دہلی اردو اکادمی نے گذشتہ برس انھیں ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا تھا۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا کے خصوصی قلمی معاونین میں شامل تھے۔

اردو، ہندی اور انگریزی پر یکساں عبور رکھنے والے محفوظ الرحمٰن نے اپنے 45 سالہ صحافتی کیریئر میں کبھی اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ انھیں قلم کی حرمت اور فکر ونظر کی آزادی بے حد عزیز تھی۔ ان کی کئی اہم کتابیں منظر عام پر آئیں۔ علاوہ ازیں اہم ترین بین الاقوامی شخصیات سے انٹرویو بھی کیے۔

شاہ خلیل احمد

● لکھنؤ۔ بزرگ صحافی شاہ خلیل احمد کا آج صبح مختصر علالت کے بعد ان کے آبائی وطن ردولی ضلع فیض آباد میں انتقال ہوگیا اور بعد نماز مغرب انھیں ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے جس کی شادی پاکستان میں ہوئی تھی۔ مرحوم خلیل صاحب روزنامہ قومی آواز سے وابستہ تھے اور وہیں سے وظیفہ یاب ہوکر اپنے آبائی وطن میں مقیم تھے۔ مرحوم نے بی ایڈ کرنے کے بعد تدریسی پیشہ اختیار کیا تھا لیکن صحافت کی طرف میلان نے انھیں قومی آواز سے وابستہ کردیا تھا۔ شاہ صاحب کا تعلق شاہ عبدالحق کے خانوادے سے تھا۔ خلیل صاحب ادبی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے وہ ردولی کے شبینہ کلب کے بانیوں میں سے تھے جس کے پرچم تلے مجاز ڈے کا مشاعرہ بڑی کامیابی سے منعقد ہوتا تھا جس میں نامور شعرا شرکت کرتے تھے۔ تنفس کی شکایت میں مبتلا ہوجانے کے بعد شاہ خلیل صاحب ادبی اور صحافتی سرگرمیوں سے تقریباً الگ ہوگئے تھے۔ بھانجے اور داماد کی حادثاتی موت سے شاہ صاحب ٹوٹ گئے تھے اور تقریباً گوشہ نشین ہوگئے تھے۔

ڈاکٹر نورالاسلام

● نئی دہلی۔ 18 جنوری، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر نورالاسلام صدیقی کا آج اچانک انتقال ہوگیا۔ مرحوم کا انتقال حرکت قلب بند ہونے کے سبب ہوا وہ 58 برس کے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کلکتہ میں ہوئی، ان کے والد مدرسۂ عالیہ میں تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے، بی ایم کالج بہار سے انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا۔ 1990 میں وہ جامعہ میں بطور استاد مقرر ہوئے۔ ان کی دو کتابیں ''مجموعۂ نفائس'' اور ''ریسرچ کیسے کریں'' شائع ہوچکی ہیں۔ انھوں نے متعدد مقالات تحریر کیے۔ اسی سال حج سے مشرف ہوئے تھے۔ وہ پابند صوم وصلاۃ تھے اور طلبہ میں ان کا درس مقبول تھا۔

عبدالمتین سلفی

● توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ کے چیئرمین مولانا عبدالمتین سلفی کے انتقال پر مولانا محمد ولی رحمانی نے رنج وغم کا اظہار کیا، انھوں نے مولانا مرحوم کے لیے مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی۔ حضرت مولانا رحمانی نے کہا کہ مولانا عبدالمتین سلفی نے دین اور امت مسلمہ کی خدمت کی، خاص کر تعلیم کے فروغ کے لیے انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے، ملت ان کی خدمت کے لیے انھیں یاد کرتی رہے گی، مولاناؒ ملت کے لیے کام کرنا جانتے تھے، اور کاموں کا بڑا جذبہ رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ مولانا کو ان کی خدمات کا بہتر صلہ دے اور جوار رحمت میں رکھے، (آمین)۔

کیف نانپوری

● کشور۔ علاقے کے معروف شاعر مہربان علی کیف نانپوری آج دوپہر اچانک حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے اس دارفانی سے کوچ کرگئے۔ گذشتہ کچھ برسوں سے وہ عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ وہ انتہائی خلیق، ملنسار اور دوست نواز شخصیت کے مالک تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ 4 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں۔ بعد نماز عشا بستی کے قبرستان میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔

□□□

تبصرہ وتعارف

کلیاتِ رشید احمد صدیقی جلد اوّل (آپ بیتی)

مصنف: رشید احمد صدیقی

صفحات: 235، قیمت: -/174 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ-6،
آر. کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر وسیم اقبال، محلہ: قاضی سرائے اوّل، نگینہ، ضلع: بجنور، یو. پی.

کلاسیکی ادب کی بازیافت کا سلسلہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں جاری ہے۔ اردو میں اس کمی کو پورا کرنے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سرگرمِ عمل ہے اور ان اہلِ قلم کے شہ پاروں کو بھی محفوظ کر لینا چاہتی ہے جو زیادہ عرصہ نہ گزرنے کے باوجود نئے کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور جن کے بارے میں قوی امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی قدر و قیمت میں اضافہ یقینی ہے۔ اسی سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے ''کلیاتِ رشید احمد صدیقی'' کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا ہے جو صنفی اعتبار سے مختلف جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ زیرِ نظر جلد اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے اس کی ترتیب و تدوین کی ذمے داری نبھائی ہے۔ پروفیسر قاسمی بحیثیت نقاد کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ حال ہی میں ان کی کتاب ''معاصر تنقیدی رویے'' پر انھیں ساہتیہ اکادمی اردو ایوارڈ 2009 کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ قاسمی اپنے تنقیدی شعور اور لسانی اظہار کے باعث گذشتہ دو دہائیوں سے برِصغیر کی نمایاں شخصیت بن چکے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ اپنی حیات ہی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اردو دنیا کے پس منظر میں Legendary Figure بن چکے تھے۔ علی گڑھ کے ذرّے ذرّے سے والہانہ محبت رکھنے والے رشید صاحب کی تحریروں میں یہاں کا عکس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے اکثر نقادوں نے اسے ان کی خوبی اور خامی دونوں بتایا ہے۔ ناقدین کا خیال ہے کہ اس عنصر نے ان کے فن کو محدود کر دیا ہے۔ مگر یہ ایک طرح کی ناانصافی بھی ہے اور علی گڑھ کی وسعتوں کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کا شاخسانہ بھی۔ درحقیقت علی گڑھ برِصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کی زندگی کے کسی بھی پہلو پر اس وقت تک سیر حاصل گفتگو نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اس میں علی گڑھ کا تذکرہ نہ ہو۔ رشید احمد صدیقی کے نزدیک کوئی شخص معقولیت کے کسی بھی مرتبے تک پہنچ جائے معراج سے دور رہ جاتا ہے اگر وہ علی گیرین نہیں ہے۔ رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ کا جو ماحول پایا تھا وہ ان اعلیٰ قدروں کا حامل تھا جن کی نظیر خصوصاً مسلم سماج میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں کا محور علی گڑھ ہے۔ یہ ان کی مشرق پرستی بھی ہے اور بلند قدروں کے تئیں ان کا عشق بھی۔ کوئی بھلے ہی ان کے فن پر محدود ہونے کی تہمت لگائے مگر وہ اس سے بے نیاز ہیں۔ اپنی اس علی گڑھ پرستی پر ان کا فخر ہی ان کے سچے اور پُرخلوص ہونے کی علامت ہے۔

رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں علی گڑھ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اس کی مخصوص قدریں، مخصوص ماحول اور مخصوص فضا ان کی تخلیقات میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ فضا بڑا وسیع تناظر رکھتی ہے اور ان مخصوص قدروں کی آئینہ داری کرتی ہے جو علی گڑھ کا طرۂ امتیاز بھی ہیں اور رشید احمد صدیقی کے اسلوب کی انفرادیت کی بھی ضامن۔

زیرِ تبصرہ جلد میں رشید احمد صدیقی کی ان مطبوعہ تحریروں کو شامل کیا گیا ہے جو صنفی اعتبار سے ''آپ بیتی'' کے دائرے میں شمار کی جاسکتی تھیں۔ نصف درجن سے زائد شامل کتاب مضامین کی تفصیل اس طرح ہے۔ آشفتہ بیانی میری، اپنی یاد میں، میرے گھر کا حال، سرگزشتِ عہدِ گل، پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ، ماضی کے دھندلکوں سے یادوں کا کارواں، ایک واقعہ: جو میں بھلا نہ سکا، اور 1915 و مابعد۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ان ادبی جواہر پاروں کو یکجا کرنے کی ذمے داری قبول کی ہے، جس کے لیے وہ قابلِ مبارکباد ہیں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذمے داران بھی جن کی نگرانی میں کلاسیکی ادب کا اہم ذخیرہ محفوظ ہو رہا ہے۔

اردو کی کہانی

مصنف: سید احتشام حسین

صفحات: 104، قیمت: -/19 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6،
آر. کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: سراج نقوی، A101، ایسٹ ایونیو، اہنسا کھنڈ-II،
نزد شانتی گوپال اسپتال، اندراپورم، غازی آباد

''اردو کی کہانی'' مشہور محقق اور ادیب سید احتشام حسین کی مشہور کتاب جو خاص طور پر بچوں اور کم پڑھے لکھے بزرگوں کے لیے آسان، عام فہم زبان میں لکھی گئی ہے جس میں اردو زبان و ادب کی تاریخ اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے ہی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی پہلی اشاعت 1956 میں عمل میں آئی تھی اور تب سے اب تک اس کے کئی ایڈیشن منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ترقی اردو بیورو نے اسے پہلی

مرتبہ 1980 میں شائع کیا تھا اور اب 2009 میں قومی اردو کونسل کے زیراہتمام اس کا چوتھا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔

کتاب میں احتشام حسین کے دو دیباچوں کے علاوہ ان کے مختصر مضامین شامل ہیں جو ایک ترتیب اور تسلسل کے ساتھ اردو کی کہانی قارئین کے ذہن نشیں کراتے ہیں۔ کتاب کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں احتشام حسین نے لکھا تھا کہ ''کتاب کے پڑھنے سے اردو ادب کی تہذیبی خصوصیات، ہندوستان کی جنگ آزادی میں اس کے حصہ لینے اور ملکی وقومی اتحاد وتعمیر کے لیے اس کی جدوجہد کا بھی تھوڑا بہت اندازہ ہوگا، دوسرے دیباچے میں انھوں نے کتاب کی غیر معمولی مقبولیت پر اظہار خوشی کرتے ہوئے لکھا کہ'' اس کا مطالعہ مختلف زبانیں بولنے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لائے گا۔''

کتاب کے پہلے مضمون کا عنوان ہے ''زبانوں کا گھر ہندوستان'' جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے اس مضمون میں ہندوستان کے تاریخی وتہذیبی پس منظر کے حوالے سے اس کے لسانی تنوع پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں واضح کیا گیا ہے کہ 1000 کے بعد سے جو نئی زبانیں ہندوستان میں بولی جانے لگیں ان میں ایک اردو زبان بھی ہے، یہ زبان کہیں باہر سے نہیں آئی، یہیں پیدا ہوئی اور یہیں کے لوگوں نے اسے ترقی دی، اس کی بناوٹ اس کا رنگ روپ سب ہندوستانی ہے۔ دراصل دور حاضر میں جب ہمارا ملک تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہا ہے اور ہمیں ہر سطح پر اتحاد کی سخت ضرورت ہے، تو اردو کے تعلق سے پھیلی ہوئی غلط فہمیاں دور کرکے اس اتحاد کو مضبوط کیا جاسکتا ہے۔ احتشام حسین نے جس سہل، آسان لیکن مدلل انداز میں اردو کا ہندوستانی ہونا ثابت کیا ہے اس سے لسانی اتحاد کو مقبولیت ملے گی اور ہماری نئی نسل اردو کی اہمیت سے واقف ہو سکے گی۔

دوسرے مضمون ''اردو زبان کی ابتدا'' میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، اردو کی پیدائش، ہندوستان کے سماجی وسیاسی حالات اور اردو کے تخلیقی عمل اور اس کے مختلف ناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرا مختصر مضمون دکن میں اردو کے فروغ کا احاطہ کرتا ہے۔ دکن میں بیجاپور اور گولکنڈہ جیسی ریاستوں کے عروج کا زمانہ اس اعتبار سے انتہائی اہم ہے کہ اسی دور میں مذکورہ دونوں ریاستوں اور جنوبی ہند کے کئی علاقوں میں سرکاری سرپرستی میں اردو کو فروغ حاصل ہوا اور اس کی جاذبیت وشیرینی نے عوام پر بھی اپنا گہرا اثر ڈالا جس کے نتیجے میں اردو کے کئی بڑے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے۔ ''دلی کی شاعری'' کے زیرعنوان مختصر مضمون میں دلی کی زبان وشاعری پر شمال کے اثرات اور دونوں علاقوں کے سیاسی وسماجی اختلاط سے وجود میں آنے والے اردو کے نئے روپ پر روشنی ڈالنے کے ساتھ سترھویں اور اٹھارویں صدی کے دکن و دہلی کے اہم شعرا کا ذکر ہے۔ دہلی سلطنت کے زوال اور اس کے نتیجے میں دہلی کی اردو شاعری پر پڑنے والے اثرات کو بھی نہایت سادہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

''ترقی کا زمانہ'' عنوان سے تحریر کیے گئے مضمون میں دلی کے 1750 کے بعد سامنے آنے والے اردو شعرا کا ذکر ہے۔ ان میں سے خواجہ میر درد، مرزا محمد رفیع سودا، میر تقی میر اور محمد میر سوز کی شاعری اور ان کے حالات پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے، جب کہ ان کے ہمعصر دوسرے شعرا کے تعلق کے بارے میں ایک دو جملے لکھ کر یا نام دے کر بات ختم کر دی گئی ہے۔

شعری وادبی سرگرمیوں کا مرکز دلی سے لکھنؤ منتقل ہونے کے حالات اور اس کے تاریخی اسباب کا بیان'' پچھم سے پورب تک'' کے عنوان سے کیا گیا ہے اس میں مصحفی، انشا اور میر حسن کا خصوصیت سے تذکرہ ہے۔ دبستان لکھنؤ پر الگ سے ایک مضمون بھی کتاب میں شامل ہے۔ اس میں ناسخ، آتش، رشک، میرانیس اور مرزا دبیر سمیت لکھنؤ کے تمام اساتذہ کا ذکر ہے۔ نثر کی ترقی پر الگ مضمون میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ دلی میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت اردو کی محفل دوبارہ سجنے اور اسی دور میں دلی واطراف کی ادبی بستیوں میں پیدا ہونے والے شعرا کا ذکر'' دلی میں ایک بہار اور'' عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔ غالب، مومن، ذوق، بہادر شاہ ظفر اور شیفتہ جیسے شاعر اسی دور میں پیدا ہوئے۔ یہ اور اس کے بعد کا زمانہ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کا زمانہ ہے۔ اسی زمانے میں اردو نثر اور شاعری دونوں کی کافی ترقی ہوئی سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی، نذیر احمد، شبلی نعمانی، ذکاء اللہ، داغ دہلوی، امیر مینائی محمد حسین آزاد، سرشار، اکبرالہ آبادی سمیت بے شمار اعلیٰ پائے کے اردو شاعر، ادیب اسی دور میں پیدا ہوئے۔ اس دور کے سیاسی وادبی حالات اور اردو کے فروغ میں ان کے رول پر ''نئی منزل کی طرف'' عنوان سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ گذشتہ صدی کے نصف اول تک سامنے آنے والے بڑے ادبا اور شعرا، اردو اخبارات اور صحافتی منظرنامے کو آخر کے تین مضامین میں پیش کیا گیا ہے۔ نظیر اکبرآبادی پر الگ ایک مضمون ہے۔ مجموعی طور پر زیرتبصرہ کتاب نوواردان ادب کو اردو زبان وادب کی تاریخ اور اس کے پس منظر سے آسان زبان میں واقف کرانے کے لیے ایک کارآمد کتاب ہے۔ ہر چند کہ اس میں اردو زبان کی ترقی وفروغ اور اس سے متعلق کئی دعووں کو بعد میں سامنے آنے والی تحقیق نے مسترد کر دیا ہے، اس کے باوجود کتاب کی اہمیت اور افادیت اپنی جگہ مسلم ہے اور یقینی طور پر اردو کونسل سے اس کی مکرر اشاعت اردو کے فروغ میں معاون ثابت ہوگی۔

جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار

مصنف: ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

صفحات: 494، قیمت: -/178 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی

مبصر: عاقل زیاد، بی-176، پاکٹ-1، میوروہار-1، دہلی-91

تاریخ نویسی ایک بہت ہی اہم کام ہے کیوں کہ اس سے موجودگان اور

آئندگان کو زندگی کا معیار اور سمت متعین کرنے میں مدد ملتی ہے، لیکن یہی کام اگر غیر منصفانہ یا غیر شفافیت پر منحصر ہو تو اختلافات کو راہ ملتی ہے اور اس سے ملک و قوم میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ پیش نظر کتاب'' جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار'' کے مطالعے سے ایک بات یہ سامنے آتی ہے کہ اس کے ہر مضمون میں واقعات کا بیان بہت ہی مربوط اور مرحلہ وار انداز میں ہوا ہے۔ ہندوستان میں سیاسی بیداری کا عمل کب سے شروع ہوا، مصنف نے گو اس کا تعین نہیں کیا ہے لیکن اپنے وسیع مطالعے اور منطقی استدلال کی بنیاد پر علمی نشاۃ الثانیہ کے دور کا ذکر کرتے ہوئے اٹھارہویں صدی کے اواخر کو اس کا مرکز تصور کیا ہے۔ مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ وہی دور تھا جب یورپ اور مغربی ملکوں میں بھی علمی نشاۃ الثانیہ کی شروعات ہوئی تھی۔ جہاں ایک طرف سماجی بیداری کو فروغ مل رہا تھا وہیں مادیت پرستی اور استحصالی ذہنیت بھی تیزی سے پنپ رہی تھی اور انگریزی سامراج اور اس کی اجارہ داری عروج پر تھی۔ اس کے برعکس ہندوستان میں علمی نشاۃ الثانیہ کا دور روحانی تصورات اور اخلاقی اقدار پر مرکوز تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ قدیم ہندوستانی روایات ویدوں اور اپنشدوں یا پرانوں کے تابع تھیں۔ لہٰذا ایک بار پھر وید، گیتا یا پران کو احیائے انسانی اور بقائے ملک وملت کے لیے لازمی قرار دیا گیا اور ان ہی مذہبی شہ پاروں کے مطالعے اور ان کی تشہیر پر توجہ مرکوز کی گئی۔ بپن چندر پال، رابندر ناتھ ٹیگور، اروند گھوش، بال گنگا دھر تلک یا مہاتما گاندھی، سب نے روحانیت کے فلسفے اور اپنشدوں یا پورانک قدروں کو عام کرنے کی کوششیں کیں۔ دوسری جانب مسلم دانشوروں مثلاً مولانا ابو الکلام آزاد، علامہ اقبال، مولانا محمد علی، مولانا شبلی، مولانا عبید اللہ سندھی، سبھی نے روحانیت کے اصولوں کو قرآن کریم کی روشنی میں زبانی یا تحریری کوششوں کے ذریعے عام کرنے کی کوشش کی۔ مسز اینی بسنت بھی روحانیت کی ہی علم بردار تھیں بلکہ ان کا نظریہ مذہبی اصولوں پر قائم تھا، ملاحظہ کیجیے۔'' وہ ویدانت کے فلسفے کو ہندو ازم اور اسلام کے مابین ذہنی رابطہ سمجھتی تھیں، وہ تجدد اور مغربیت کی شدید مخالف تھیں۔'' پنڈت نہرو روحانیت کے حمایتی تھے نہ اس کے مخالف۔ ان کے مزاج کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا خالی از دلچسپی نہیں کہ پنڈت جی کو اگر مہاتما گاندھی سے عقیدت تھی جو اہنسا کے حامی تھے تو دوسری طرف وہ سبھاش چندر بوس سے بھی گہری وابستگی رکھتے تھے جنھوں نے حصول آزادی کے لیے تشدد کا راستہ اپنایا۔ سرسید احمد خاں کے سماجی نظریے کی بابت ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے لکھا ہے کہ'' وہ قدامت پسندی کے شدید مخالف تھے اور اس پر زور دیتے تھے کہ مسلمان ایسے تمام رسوم اور رواج بالکل ترک کردیں جن سے ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پڑتی ہے'' یہاں قدامت پسندی سے مراد فرسودہ روایات ہیں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ مذہبی امور کی پاسداری سے وہ کبھی غافل نہیں رہے البتہ تعلیمی میدان میں جدت کے زبردست حامی تھے۔

اس کتاب میں کل 27 مضامین ہیں اور ہر مضمون اپنی جگہ ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جدید ہندوستان کی اہم شخصیات اور معماران وطن کے نظریات وخیالات کو سمجھنے میں اس کتاب سے کافی کچھ مدد ملتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان تمام نظریات کا منطقی تجزیہ کیا جائے تو ان کا ماحصل بہت حد تک مشترک معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں بلا تفریق مذہب وملت وعلاقائیت ہندوستان بھر کے نامور دانشوروں کا ذکر ہے جنھوں نے اپنے خون دل سے جدید ہندوستان کی سرزمین کو سینچا ہے۔ سچے تاریخ دانوں کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ ہر قسم کے تعصبات سے گریز کرتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں بھی اختلافی امور سے اجتناب کیا گیا ہے۔ جبکہ حالیہ چند برسوں میں تاریخ پر چند ایسی کتابیں اور مضامین بھی سامنے آئے جن کی وجہ سے کئی قسم کے تنازعات پیدا ہوئے۔ ظاہر ہے ایسی کتابیں یا مضامین بھارت کے ان سچے سپوتوں کے جذبے کی توہین ہے۔ کتاب میں حوالہ جاتی نکات یا نامانوس اردو اصطلاحات کے انگریزی ترجمے یا پھر انگریزی اصطلاحوں کا اردو متبادل دے کر قاری کے لیے آسانیاں فراہم کر دی گئی ہیں۔ اس کی پہلی اشاعت 1985 میں ہوئی تھی۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے، اس سے بھی کتاب کی مقبولیت اور معتبریت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ طباعت صاف ستھری اور اغلاط سے پاک ہے۔

سہ ماہی فکر و تحقیق

شمارہ: 4، جلد: 12

صفحات: 160 : قیمت: -/25 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

مبصر: معین شاداب، پوسٹ باکس نمبر-9787، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سہ ماہی رسالے 'فکر و تحقیق' نے زیر نظر شمارے کے ساتھ اپنی اشاعت کے بارہ برس مکمل کر لیے ہیں۔ اس مدت میں رسالہ زبان و ادب کے نامعلوم خزینوں کی دریافت اور موجودہ سرمائے کی بازیافت کے اپنے ایجنڈے پر کاربند رہا ہے۔ صف اول کے اس تحقیقی اور تنقیدی مجلے نے جس سنجیدگی اور تمکنت کے ساتھ نئی بلندیاں طے کی ہیں وہ لائق ستائش بھی ہیں اور اس کی مقبولیت میں بتدریج اضافہ کا سبب بھی۔

بارہویں جلد کے اس آخری شمارے میں سات مضامین شامل ہیں اور یہ ساتوں تحریریں موضوع اور مواد کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں۔

مولانا سید عبدالخالق پر حنیف کیفی کا مقالہ پر از معلومات ہے۔ 35 صفحات کو محیط یہ مضمون اپنے زمانے کے جید عالم کی جلالت علمی اور ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کا بہ طریق احسن احاطہ کرتا ہے۔ یہ مقالہ نہ صرف ان

لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہے جو مولانا کے ہم نشیں یا ان کے متعلقین میں رہے ہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی مفید ہے۔

دوسرا مضمون شہپر رسول کا ہے۔جس کا عنوان ہے ''اردو غزل میں جمہوری اور سیکولر قدروں کی نمائندگی''۔شہپر رسول نے اپنے اس مضمون میں سیکولرزم اور جمہوریت کے تصوّر کو مختلف تعریفوں اور مثالوں سے واضح کرتے ہوئے غزل کے سیکولر اور جمہوری کردار کو اجاگر کیا ہے۔مضمون نگار نے قلی قطب شاہ سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک مختلف شعرا کے اشعار کے حوالے سے یہ باور کرایا ہے کہ غزل ہر دور میں روشن خیال، روادار اور وسیع المشرب رہی ہے۔

محمد سلمان منصور پوری نے ''تحریک شیخ الہند کا آغاز وانجام'' میں مولانا محمود حسن کی ریشمی رومال تحریک کا محاکمہ کیا ہے۔انھوں نے تحریک کی ابتدا، ارتقا اور اس کے نتیجے پر معنی خیز گفتگو کی ہے۔

وقار صدیقی نے عالمگیر ثانی کے عہد کے شاعر میر سید علی غمگین کی شاعری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ کتابیات اور حواشی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مضمون نگار نے کافی عرق ریزی کی ہے۔

''کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری'' سے بحث کرتے ہوئے ضیاء الحسن یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کلیم الدین احمد کے نقطۂ نظر سے ادبی اور منطقی بنیادوں پر اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن انھیں یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔کلیم الدین احمد نے اردو میں نئے انداز تنقید کی بنیاد ڈالی ہے۔

زبیر شاداب نے اپنے مضمون میں تحریر کی ابتدا اور اس کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو رسم خط کی تاریخ بیان کی ہے۔مشتاق صدف نے آزادی کے تصور اور تحریک کو مہمیز کرنے والی ان نظموں کا مطالعہ پیش کیا ہے جنھیں ضبط کر لیا گیا تھا۔مشتاق صدف نے کئی اہم سوالات قائم کیے ہیں۔مثلاً اردو شعرا کے یہاں وطن سے محبت کا جذبہ کیسے پھلا پھولا، انھوں نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ کیوں دیا، انگریزوں نے انقلابی اور احتجاجی نظموں کے ساتھ حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے جذبے سے معمور نظموں کو بھی کس لیے ضبط کیا؟

اپنی روایت کے مطابق 'فکر وتحقیق' کا تازہ شمارہ تحقیق وتنقید سے وابستہ لوگوں کے لیے وافر مقدار میں کارآمد مواد دستیاب کراتا ہے۔

'فکر وتحقیق' کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر اس کی توسیع اشاعت میں حصہ لیا جانا چاہیے۔

یوسف مہر علی— نئے افق کی کھوج (سوانح حیات)

مصنف: مدھو دنڈوتے، مترجم: نند کشور وکرم

صفحات: 143، قیمت: -/50روپے

ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، A-5، گرین پارک، نئی دہلی-110016

مبصر: عرشیہ خانم، اے۔170، گراؤنڈ فلور، سوریا اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی

''یوسف مہر علی— نئے افق کی کھوج'' یوسف مہر علی کی سوانح حیات ہے جو مدھو دنڈوتے نے لکھی ہے۔یہ دس ابواب میں منقسم ہے۔یوسف مہر علی ایک سرگرم مجاہد آزادی تھے، ہمارے ملک کی جنگ آزادی میں ان کا نمایاں رول رہا ہے۔ان کی زندگی کا سرگرم دور 1927 سے 1947 تک رہا۔وہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے بانیوں میں سے تھے۔انھوں نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے لیے ایک ایسا لائحہ عمل بنایا تھا جس سے کانگریس سوشلسٹ پارٹی ایک چھوٹے سے کارکن پر مبنی ایک تنظیم بن سکتی تھی جو نئے سماجی ڈھانچے کی تعمیر کے لیے اول درجے کی قیادت عطا کر سکتی تھی۔یوسف مہر علی نے اپنے پروگرام کو متحرک کرنے کے لیے مختلف علاقوں میں اسٹڈی سرکلوں کا سلسلہ منظم کیا اور اس کے لیے خصوصی طور پر سوشلسٹ نصاب بھی تیار کیا تاکہ سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد مضبوط ہوسکے اور سماج اور ملک کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکے۔

زیر تبصرہ کتاب میں ویسے تو یوسف مہر علی کی زندگی کے بہت سے گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے مگر خاص طور سے یوسف مہر علی کی شخصیت کے تین پہلو ہمارے سامنے ابھر کر آتے ہیں۔جن کا اثر ہمارے ذہنوں پر دیرپا ہوتا ہے۔پہلی بات یہ کہ انھوں نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے لیے ایک منصوبہ بند لائحۂ عمل تیار کیا تھا۔اس حوالے سے ان کے ذہن میں ایک بڑا ویژن تھا۔دوسری بات یہ کہ یوسف مہر علی انسان نواز شخصیت کے مالک تھے وہ سب سے خلوص ومحبت سے پیش آتے تھے۔ان کے ہاں تنگ نظری پر مبنی مذہبی وابستگیوں کا کوئی بھی مقام نہیں تھا۔ان کو ہندوستان کے قدیم ورثے سے بہت پیار تھا وہ ہر قیمت پر اس کی پاسبانی چاہتے تھے۔ان ہی صفات کی وجہ سے وہ عوام میں بہت مقبول تھے۔اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بڑی اکثریت سے ممبئی کے میئر منتخب ہوئے تھے۔آخری بات یہ کہ انھیں قدرت سے بہت لگاؤ تھا۔وہ ہمالہ کے سلسلہ ہائے کوہ کے سامنے پہنچ کر ایسے مسحور ہوگئے کہ گھنٹوں ہمالہ کے قدرتی سحر میں کھوئے رہے۔آج کل ماحولیات کے تحفظ پر بہت زور دیا جارہا ہے جبکہ برسوں قبل یوسف مہر علی ماحولیات کے تحفظ کے زبردست حامی ومبلغ تھے۔اس سے ان کے ماحولیات سے لگاؤ اور دوررس ذہن کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ہمارے سامنے ہر لحہ کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے جس سے ہم کوئی نہ کوئی سبق حاصل کرتے رہتے ہیں۔سیکھنے کے اس عمل میں ہمارے تجربات و مشاہدات کے علاوہ کتب بینی بھی ایک اہم ذریعہ ہے جس کی مدد سے ہم اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے بے شمار باتیں جانتے اور سیکھتے ہیں۔چونکہ کتابوں میں جو باتیں تحریر ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی شخص کے تجربے، مشاہدے اور مطالعے میں آئی ہوئی باتیں ہوتی ہیں۔مطالعۂ کتب کے اس نکتے کو اگر ہم ذہن میں رکھیں تو ''یوسف مہر علی— نئے افق کی کھوج'' انسانی اقدار کے تنزل کے اس دور

قیام رانچی سے متعلق بعض نئے حقائق پیش کیے ہیں مولانا آزاد کے بیرونی سفر سے متعلق ان کا دوسرا مقالہ بھی اہم ہے۔ عبدالقوی دسنوی کی تحقیق نے تقریباً ثابت کردیا ہے کہ 1905 اور 1908 میں جیسا کہ مولانا آزاد نے لکھا ہے، دو سفر نہیں کیے، بلکہ ایک ہی بار 1908 میں بیرون ملک کا سفر کیا۔ جمشید قمر کا مضمون دسنوی کی تحقیق کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ سید حسن اور صفدر امام قادری کے مضامین بالترتیب مولانا کی سیاسی زندگی اور تعلیمی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

نیپال میں اردو زبان و ادب

مصنف: ڈاکٹر قسیم احمد قسیم

صفحات: 216، قیمت: -/110 روپے

ناشر: ڈاکٹر قسیم احمد قسیم، محلہ کالی باغ، بیتیا-845438

یہ کتاب پڑوسی ملک نیپال میں اردو زبان و ادب کی صورت حال سے متعارف کراتی ہے۔ کتاب مقدمے کے علاوہ پانچ ابواب اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے جن کے عنوانات ہیں:

نیپال کا تاریخی، تہذیبی اور سیاسی پس منظر، نیپالی ادب کی خصوصیات، نیپالی زبان و ادب پر اردو کے اثرات، نیپال میں اردو زبان کی صورت حال، نیپال میں اردو ادب اور عکس و دیگر نمونے۔ مقدمے میں مصنف کتاب کا مختصر مگر جامع تعارف کرادیا ہے، لکھتے ہیں:

''میں نے اس کتاب میں حتی المقدور یہ کوشش کی ہے کہ نیپال کا پورا ادبی منظرنامہ آئینہ ہوجائے۔ ابتدا میں نیپال کا تاریخی، تہذیبی اور سیاسی پس منظر اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ نیپالی ادب کو سمجھا جاسکے اور نیپالی ادب پر اردو کے اثرات واضح ہوسکیں۔ نیپال میں اردو ادب کا آغاز مغلوں کے دور اول میں ہی ہوگیا تھا لیکن باضابطہ اس کی ترقی و ترویج اودھ کی بیگم حضرت محل کی نیپال آمد کے بعد شروع ہوئی۔ اس کتاب میں نہ صرف نیپالی نژاد اردو شاعر، افسانہ نگار، تنقید نگار اور مزاح نگار موجود ہیں بلکہ اردو زبان کے فروغ میں دن رات کام کرنے والے ادارے اور شخصیات بھی شامل ہیں۔ اس میں اردو زبان کے ارتقا اور موجودہ صورت حال کو بھی پیش کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی گئی ہے۔''

یہ پہلی کتاب ہے جو امید ہے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

سعداللہ مسیح اور فارسی رامائن مسیحی

مصنف: ابوسعادت جلیلی

صفحات: 485، قیمت: -/225 روپے

ناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ-4

''فارسی رامائن مسیحی'' کے مصنف، شیخ سعداللہ مسیح فارسی کے ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ انھوں نے جہاں گیر اور شاہ جہاں کا عہد دیکھا تھا۔ گرچہ کبھی دربار شاہی تک ان کی رسائی نہیں ہوئی لیکن دربار سے منسلک شعرا میں شیدا اور مرزا صائب سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ لیکن اس باکمال شاعر کو جو شہرت ملنی چاہیے تھی نہ مل سکی۔ یہی وجہ ہے کہ سعداللہ مسیح کے نام، تخلص اور مولد و مسکن کے بارے میں بھی کافی اختلاف رائے ہے۔ سعداللہ مسیح نے کہیں اپنا تخلص مسیحا لکھا ہے، کہیں مسیح، کہیں مسیحی تو کہیں مسیحائی، جس کی وجہ ضرورت شعری بتائی جاتی ہے۔ مرتب شدہ شکل میں اب تک ان کا کوئی دیوان دستیاب نہیں۔ ان کی ایک فارسی مثنوی ''پیغمبر نامہ مسیح'' ہے جو بیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ پیغمبر اسلام کی منظوم سوانح ہے۔ دوسری رامائن منظوم ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور شعری تخلیق ''رسالہ مسیحا منظوم'' ہے۔ سعداللہ مسیح کی حیات و شخصیت پر اب سے قبل صرف سرسری اور مختصر مقالے لکھے گئے ابوسعادت جلیلی کی یہ کتاب اولین تحقیق ہے جو ایک معتبر دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب آٹھ حصوں میں منقسم ہے۔

ضمیر اپنا اپنا

مصنفہ: اندرا شبنم اندو

صفحات: 128، قیمت: -/100 روپے

ناشر: اسپاق پبلی کیشنز، سائرہ منزل، 230/B/102، دمان درشن، نجے پارک، لوہ گاؤں روڈ، پونہ، مہاراشٹر

''ایک آگ سلگتی رہتی ہے، بھڑکتی رہتی ہے میرے اندر۔ میرے باہر۔ ایک لاوا بہتا رہتا ہے۔'' الفاظ اندرا شبنم اندو کے ہیں۔ جن سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں جھنجھلاہٹ اور غصے کا عنصر زیادہ ہوگا۔ مگر ان کے افسانوں نے ان کے اندر اور باہر سلگتی بھڑکتی آگ کی تیزی کم کردی ہے۔ اندرا شبنم اندو کی یہ 13ویں کتاب ہے۔ اس سے قبل سندھی میں چار، ہندی میں پانچ اور اردو میں چار کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ اندو غزلیں، آزاد نظمیں اور افسانے لکھتی ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کیا جاتا رہا ہے اور اب تک ان کی گیارہ کتابوں کو ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔ اس مجموعے میں کل 13 افسانے ہیں اور یہ ان کی 13ویں ہی کتاب ہے مصنفہ نے تصورات کو حقائق پر فوقیت دی ہے مگر تصورات کو بے لگام نہیں ہونے دیا ہے۔ حقیقت اور تصور کے سنگم سے ہی تخلیق کو لمبی عمر ملتی ہے۔

سرچشمۂ ابدی

شاعر: ادراک الزماں بھٹی

صفحات: 299، قیمت: درج نہیں

ناشر: سمین پبلشنگ پرائیویٹ لمیٹڈ، 108 ودیا نگر سوسائٹی پارٹ-1، خان پورہ، احمد آباد (گجرات)

یہ 36 آزاد نظموں کا مجموعہ ہے جسے انگریزی زبان میں The Eternal Spring کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس مجموعے کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ اردو کی نظموں پر مشتمل ہے دوسرے حصے میں اردو نظموں کو انگریزی زبان کا قالب عطا کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں ان تمام نظموں کو دیوناگری رسم الخط میں منتقل کردیا گیا ہے۔ یعنی یہ مجموعہ اردو، انگریزی اور ہندی کا سنگم ہے۔ ادراک نے اپنے نانا سے متاثر ہوکر عیسائی مذہب اختیار کیا جو ایک راہب تھے۔ ان کے گھر میں روزانہ عبادت کے دوران اردو کی انجیل سے نئے عہد نامے کا ایک باب ضرور پڑھا جاتا تھا اور اس موقع پر ان کی والدہ اردو میں دعا مانگتی تھیں جس نے ان کے لیے اردو سے متعارف ہونے کے مواقع فراہم کیے ان کے والد معاشیات کے پروفیسر تھے اس لیے انھوں نے اپنے بیٹے کو بھی اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ وہ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کے علاوہ فلسفے اور سائنس سے بھی متاثر ہوتے رہے جن فلسفیوں کے خیالات سے انھوں نے اثر قبول کیا ان میں لورتھ ہیڈ کا نام سرفہرست ہے جس نے مادی دنیا اور انسانی زندگی میں فرق کو واضح کیا اور محبت کو زندگی کے لیے لازمی قرار دیا۔

ایسے ہی خیالات ادراک بھٹی کی نظموں کے موضوعات ہیں۔

بھٹی صاحب کی شاعری میں مناظر قدرت، جنگل، صحرا، کوہسار، ندیاں، برفستان کا جابجا ذکر ملتا ہے۔ پھول، کلیاں، پرندے میں بھی ان کے اشعار کے کردار ہیں۔

بقول قرۃ العین حیدر، جنھوں نے اس مجموعے کا پیش لفظ قلمبند کیا ہے۔

''ادراک الزماں بھٹی کی شاعری نے خیابان اردو میں ایک نئی پرفضا روش کا اضافہ کیا ہے۔ موصوف کا کلام دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ اور یہ محض تکلفاً یا رسماً نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے لکھا گیا ہے۔''

اردو نظموں کو انگریزی زبان کے قالب میں منتقل کرکے ادراک نے انگریزی شاعری میں بھی قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

مٹی میرے دیار کی

مصنف: عنایت علی

صفحات: 359، قیمت: -/100 روپے

ناشر: المصنفین، مکان نمبر 64-12، ''موتا'' محلہ گھاٹی، اورنگ آباد

یہ کتاب مراٹھواڑہ کے اردو افسانے کی ایک انتھالوجی ہے۔ جو مراٹھواڑہ کے تقریباً ایک صدی کے لکھنے والوں کو اپنے صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ مراٹھواڑہ میں اردو افسانہ 1960 کے بعد لکھا گیا لیکن عنایت علی نے یہاں افسانے کی عمر 70 سال بتائی ہے۔ افسانہ نگاروں کی ترتیب بہ لحاظ تاریخ پیدائش رکھی گئی ہے۔ کل 46 افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہیں جو 1929 سے لے کر 2000 کے دور میں شائع ہوئی ہیں۔ ہر افسانہ نگار کے افسانے سے قبل افسانہ نگار کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔

□□□

''اردو دنیا'' کے مضمون نگاروں سے گزارش

- بات پوری وضاحت سے کہیں لیکن عبارت آرائی سے گریز کریں۔
- ''اردو دنیا'' میں ایسے مضامین کی اشاعت کو ترجیح دی جاتی ہے جو عصری زندگی کے کسی اہم پہلو پر روشنی ڈالتے ہوں۔
- زبان آسان اور عام فہم استعمال کریں اور اختصار کو ملحوظ رکھیں۔
- بچوں کے کالم کے لیے کہانی یا مضمون کم سے کم 2000 الفاظ پر مشتمل ہو۔
- غیر طلبیدہ مضامین ناقابل اشاعت ہونے کی صورت میں تبھی واپس ہوسکیں گے جب ان کے ساتھ مناسب سائز کا ٹکٹ لگا لفافہ موصول ہو۔

—ایڈیٹر

• بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

شجاع الدین شاہد

درختوں کی لڑائی

اس گھنے جنگل میں مختلف قسم کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ وہ مہذب لوگوں کی طرح مل جل کر ایک ساتھ رہتے تھے۔ ست پڑا کی پہاڑی ہواؤں سے ان کی ڈالیاں ایک دوسرے سے گلے ملتی نظر آتیں۔ کبھی کبھی ان درختوں کی آپس میں تو تو میں میں بھی ہو جاتی جو کہ ایک قدرتی عمل ہے۔ ایک دن یوں ہوا کہ چند شریر بچے آم اور املی کے لالچ میں اس جنگل میں پہنچ گئے۔ آم کی شاخیں بور سے لدی دیکھ کر ان کے منھ میں پانی بھر آیا۔ پھر کیا تھا بچوں نے آموں کے درخت پر پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ بچے نشانہ باز تو ہوتے نہیں جو اچوک نشانہ لگاتے۔ آم کے درخت کے پڑوس میں پیپل کا درخت تھا، چند پتھر اس کے بھی جا لگے۔ پیپل کے درخت کو غصہ آ گیا۔ لال پیلا ہو کر آم کے درخت سے بولا ''یہ کیا طوفانِ بدتمیزی بپا کر رکھا ہے؟ کیا شباب پہلی بار تمھیں پر آیا ہے جو جھوم جھوم کر خود نمائی کر رہے ہو اور بدتمیز آدم زادوں کو دعوتِ نظارہ دے رہے ہو'' آم کے درخت کو بھی غصہ آ گیا وہ بھی پیپل کے درخت سے الجھ پڑا ''میاں پیپل ذرا زبان سنبھال کے بات کرو۔ تمھیں پتہ نہیں تم کس سے بات کر رہے ہو۔ میرے پھلوں کو پھلوں کا راجہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے میری حیثیت بھی بادشاہ کی سی ہے۔ بادشاہوں کے ایوانوں سے لے کر شاعروں کے دیوانوں تک میرے چرچے ہیں۔ غالب تو تاعمر میرے قصیدے گاتے رہے اور تم ہجو پر اتر آئے؟ میرے جھومنے پر تمھیں اعتراض کیوں؟ تم بھی ہواؤں کے جھونکوں کے ساتھ بے سری تالیاں بجاتے ہو۔ برسوں سے سن رہا ہوں مگر ہماری عادت ہے کہ ہر کس و ناکس کے منھ نہیں لگتے اور تمھاری طرح بانجھ تھوڑے ہی ہوں۔ ہر سال پھل دیتا ہوں وہ بھی لذیذ۔''

پیپل نے کہا ''آپ ذاتیات پر اتر آئے ہیں یہ اچھی بات نہیں۔'' تب آم کے درخت سے لپٹی اک طفیلی بیل نے کہا ''پیپل بھائی جھگڑا تو آپ نے ہی شروع کیا تھا۔'' اس پر پیپل کا درخت اس پر بھی غصے سے پھٹ پڑا۔ ''چپ رہو طفیلی! دوسروں کی روٹیوں پر زندگی گزارتی ہو بے شرم کہیں کی۔'' طفیلی بیل اپنا سا منھ لے کر رہ گئی۔ مگر یہ بات اس کے قریب کھڑے املی کے درخت کو بری لگی۔ املی کے درخت نے کہا۔ ''پیپل میاں تم اس ننھی سی طفیلی بیل پر اپنا غصہ کیوں اتار رہے ہو۔ بے چاری کمزور لاغر، لیلیٰ کی کمر کی طرح پتلی، اسے کیوں ڈانٹ پلا رہے ہو۔''

پیپل اب املی کے درخت سے الجھ پڑا ''ہمارے جھگڑے میں اب تم کہاں سے آ کودے۔ تمھیں تو میں بعد میں دیکھ لوں گا۔ تمھارے نام کے بھی کئی پتھر مجھے لگے ہیں مگر کڑوے اور کھٹے درختوں کے منھ لگنا شریف درختوں کی عادت نہیں ہوتی۔'' کڑوے کا لفظ سن کر نیم کا درخت بھی آگ بگولہ ہو گیا۔ ''یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے؟ کڑوا کسے کہا تم نے؟ یاد رکھو ہم بھی منھ میں زبان رکھتے ہیں۔ میری کڑواہٹ تمھیں نہیں بھاتی۔ لیکن دنیا کے مفید ترین درختوں میں میرا شمار ہوتا ہے۔ ہر چند کہ جنت کے باغوں کے بیان میں میرا کہیں ذکر نہیں ہے۔ مگر اپنی خصوصیات کی بنا پر وہاں میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ایک شاعر پیام سعیدی نے میرے بارے میں کیا خوب کہا ہے:

پھل کڑوا دیتا ہے لیکن سایہ ٹھنڈا دیتا ہے
بوڑھے نیم کو سوچ رہا ہوں میں کب سے بیٹھا بیٹھا

پیپل کا درخت گویا ہوا'' شاید تم سب درختوں نے میرے خلاف محاذ بنالیا ہے۔ میری بزرگی اور تقدس کی بنا پر تم سب مجھ سے حسد کرنے لگے ہو۔ لوگ باگ دور سے ہی میرے آگے سر جھکاتے ہیں، عورتیں آکر میری خاطر مدارات کرتی ہیں، میرے تنے سے ڈوریاں باندھتی ہیں، میرے گرد طواف کرتی ہیں۔ یہ صدیوں سے ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔'' املی کے درخت نے طنزیہ لہجے میں کہا'' بڑے مقدس بنتے ہو۔ یہ دکھاوا ہے صرف دکھاوا۔ درختوں کی دنیا میں تم سے بڑا خود غرض کوئی نہیں۔ اپنے زیر سایہ کسی کو پنپنے نہیں دیتے۔ خود کہیں بھی، کسی بھی زمین پر، کبھی کسی عمارت پر کہیں کسی درخت کے زیر سایہ اگ آتے ہو اور پنپ جاتے ہو۔ دوسروں کو اپدیش دینا بند کرو۔''

ببول کا درخت جو خاموشی سے یہ سب سن رہا تھا، اب وہ بولا'' آپس میں لڑو گے تو دوسروں کا بھلا ہوگا۔'' آم کے درخت نے اسے ڈانٹ پلائی'' چپ رہو! تم بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑے۔ تمھاری زبان میں بھی تمھاری طرح کانٹے ہی کانٹے ہیں۔'' بے چارہ ببول اپنا سا منھ لے کر رہ گیا۔ پھر کیا تھا درختوں کے بیچ میں گھمسان مچ گئی۔ برگد کا ایک بوڑھا درخت، کسی جہاندیدہ بزرگ کی طرح درختوں کی بے تکی تکرار اور لڑائی بہت دیر سے سن اور دیکھ رہا تھا۔ برگد نے گرجدار آواز میں کہا۔'' بند کرو یہ ہڑ بونگ۔ ببول نے سچ کہا ہے۔ حالانکہ ہمارے سماج میں اسے تیسرے درجے پر رکھا گیا ہے۔ مگر یہ درجہ بندی آدم زادوں نے اسے بے وجہ بدنام کرنے کے لیے کی ہے۔ خاص طور پر شاعروں نے۔ آپس کی لڑائی سے نقصان اٹھاؤ گے۔ لڑنا ہے تو اپنے وجود کی بقا کے لیے آدم زادوں سے لڑو جو کلہاڑیاں اور آرے لیے تم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ لاکھوں درخت ہر سال شہید کر دیے جاتے ہیں اس وقت تمھاری زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ تم ان کے خلاف صف آرا کیوں نہیں ہوتے۔ ہماری کم ہوتی ہوئی تعداد کی وجہ سے کائنات کا توازن بگڑ رہا ہے۔ یہ سر پھرا انسان ہمیں پر نہیں اپنے پیروں پر بھی کلہاڑی مار رہا ہے۔ حالانکہ سبھی انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کچھ امن پسند اور دوررس نگاہ رکھنے والے انسان بھی ہماری بقا کے لیے آواز بلند کر رہے ہیں۔ تم سب جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیداوار ہو۔ میں نے کئی صدیاں دیکھی ہیں۔ آدم زاد اپنے ایک ممتاز فرد حضرت امیر خسرو کی مثال دیتے ہیں کہ انھوں نے سات بادشاہوں کی حکومت دیکھی۔ مگر میں نے راجا مہاراجاؤں سے لے کر انگریزی حکومت اور ان کے بعد جمہوریت کے تماشے بھی دیکھے ہیں اور دیکھ رہا ہوں ایک بات یاد رکھو قدرت کے کارخانے میں کوئی بھی چیز نکمی نہیں ہے۔ انسان، حیوان، نباتات سب لازم و ملزوم ہیں۔ ہمارے توسط سے بادل برستے ہیں، ہم ہی کاربن کو آکسیجن میں تبدیل کرتے ہیں، اگر ہم نہ رہے تو یہ کائنات بھی نہیں رہے گی۔ ہم نے ہی اپنی مضبوط بانہوں سے زمین کو جکڑ رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ زمین زلزلوں اور قدرتی آفات سے بچی رہتی ہے۔''

پھر یوں ہوا کہ بجلیاں کڑکنے لگیں۔ زمین تھرتھرانے لگی اور تیز آندھیاں چلنے لگیں۔ برگد کی جہاں دیدہ نگاہوں نے محسوس کر لیا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس نے تمام درختوں کو حکم دیا کہ اپنی اپنی جڑوں کے حصار کو مضبوط کر لیں، آپس میں مل کر طوفانی ہواؤں کا مقابلہ کریں۔ تب سبھی درختوں نے رنگ و نسل کی تفریق کو بھلا کر برگد کے حکم پر سرِ تسلیم خم کیا۔ طوفانی ہواؤں کا زور کم ہوا تو سبھی درختوں نے دیکھا کہ زمین میں اس جگہ شگاف پڑ گئے تھے جہاں درخت نہیں تھے۔ اگلے ہی لمحے سارے درخت ساری تلخیاں بھول کر شیر و شکر ہو گئے۔

□□□

75/599, M.H.B. Colony, Gate No. 8,
Gaikwad Nagar, Malwani, Malad (W), Mumbai-95 (MS)

کتب فروشوں اور ادب کے قارئین کے لیے خوشخبری

قومی اردو کونسل کی مندرجۂ ذیل مطبوعات 75 فیصد کمیشن پر طلب کی جاسکتی ہیں

اپنی ضرورت کی کتابوں کا آرڈر آج ہی بھجوائیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف/مترجم	قیمت اصل	قیمت مابعد رعایت 75%
01	آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی	بنی پرشاد/ رحم علی شاہ	123.00	31.00
02	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	غلام ایم لعل زاد/ شعیب اعظمی	80.00	20.00
03	عہدِ ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	کے .سی. ہیڈس/ مہ جبیں اختر	55.00	14.00
04	علی وردی اور اس کا عہد	کالی کنکر دتا/ عبدالاحد خاں خلیل	86.00	22.00
05	عشری درجہ بندی	سیلول ڈیوی/ سید محمود حسن قیصر	167.00	42.00
06	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	آر. بی. سکسینہ/ صادق احمد	331.00	83.00
07	چولا راجگان	کے. ایل. نیل کنٹھ شاستری	209.00	52.00
08	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	جان ہاسپرس/ ایس. اے. شیدا	120.00	30.00
09	فیودر دستوئیفسکی	ظ. انصاری	52.00	13.00
10	غرائب الجمل	نواب عزیز بیگ ولا/ حسن الدین احمد	76.00	19.00
11	گلشنِ بے خار	نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ	128.00	32.00
12	ہمارا قدیم سماج	سید سخی حسن نقوی	54.00	14.00
13	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	بسمل پرساد/ محمد محمود فیض	33.00	08.00
14	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	ایم پی جین/ انوار یقین	262.00	66.00
15	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	اے. کے. نیرولکر	52.00	13.00
16	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	ایچ. این. سنہا/ محمد سلیم قدوائی	95.00	24.00
17	ہندوستانی معیشت	الک گھوش/ محمد خلیق	134.00	34.00
18	ہندوستانی مصوری عہد مغلیہ میں	برسی براون/ عبید الحق	158.00	40.00
19	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	انیس فاروقی	130.00	33.00
20	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	سید ممتاز مہدی	92.00	23.00
21	ابتدائی علمِ شہریت	ایس. این چٹوپادھیائے/ شریف الحسن نقوی	47.00	12.00
22	انسانی ارتقا	ایم. آر. ساہنی/ احسن اللہ	70.00	18.00
23	انتظامی قانون کے اصول	ایم. پی. جین	120.00	30.00
24	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد۔1-6)	کلیم الدین احمد، مدیر	3400.00	850.00
25	جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد۔1-4 اور 6-8)	قومی اردو کونسل	1790.00	448.00
26	جنت سنگار	سیدہ جعفر	180.00	45.00

27	کلیات پریم چند (جلد 1 تا 24)	مدن گوپال	4071	1018.00
28	للو لال جی ایک ادبی سوانح	ابو سعادت جلیلی	72.00	18.00
29	لغت ابجد شماری (جلد۔1، حصہ دوم)	سید احمد	387.00	97.00
	لغت ابجد شماری (جلد۔2، حصہ اول و دوم)			
30	مجموعۂ نغز	قدرت اللہ قاسم	268.00	67.00
31	مسدود راہیں	زاہدہ زیدی	126.00	32.00
32	مثنوی بہرام وگل اندام	ابن سعید اختر	66.00	17.00
33	مولیئر	ثریا حسین	57.00	14.00
34	مسلم ہندوستان کا زرعی نظام	ڈبلیو ایچ مورلینڈ/ جمال محمد	92.00	23.00
35	اڑیسہ میں اردو	حفیظ اللہ نیولپوری	157.00	39.00
36	پشکن	ظ. انصاری	60.00	15.00
37	قدیم ہندی فلسفہ	رائے شیو موہن لال ماتھر	82.00	21.00
38	قدیم ہندوستان میں شودر	رام سرن شرما/ جمال الدین محمد	82.00	21.00
39	قومی زبان	زیڈ. اے. احمد	76.00	19.00
40	قواعد کیٹیلاگ سازی	محمد ضیاء الدین انصاری، مترجم	268.00	67.00
41	صنعتی تنظیم اور انتظام	محمد احترام الدین	149.00	37.00
42	سیرِ کہسار	پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی/ امیر حسن نورانی	167.00	42.00
43	طبیعیات کے بنیادی تصورات	آرتھر بیزر/ احمد وکیل	82.00	21.00
44	تمل ناڈو میں اردو	علیم صبا نویدی	135.00	34.00
45	تنقید عقل محض	سید عابد حسین	158.00	40.00
46	تاریخِ طبعی (جلد۔1)	شمس الدین قادری	43.00	11.00
47	تاریخ فلسفہ سیاسیات	مجیب	97.00	24.00
48	تشریحی تصاویر	حکیم محمد کبیر الدین	66.00	17.00
49	توضیحی لسانیات	ایچ. ایل. گلیسن /عتیق احمد صدیقی	136.00	34.00
50	تذکرۂ مخطوطات (جلد۔5-1)	محی الدین قادری زور	431.00	108.00
51	تالستائے	محمد یٰسین	46.00	11.00
52	اصولِ معاشیات	سید علی	47.00	12.00
53	اتر پردیش کے لوک گیت	اظہر علی فاروقی	120.00	30.00
54	وجے نگر کے عہد میں نظامِ حکومت	کے. اے. نیل کنٹھ شاستری	118.00	30.00
55	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	سر مورٹیمر/ زبیر رضوی	45.00	11.00
56	وضاحتی کتابیات (جلد 1، 3-22)	گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی	2650.00	663.00
57	زرعی انکشافات	محمد شفیع	192.00	48.00

58	آسان اردو شارٹ ہینڈ	سید راشد حسین	92.00	23.00
59	عکس اور برعکس	سدھا مورتی / ابوالکلام	128.00	32.00
60	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	سلامت اللہ خاں	52.00	13.00
61	دھوپ چولھا	ایم۔ایم۔ ہدیٰ/ ڈاکٹر خلیل اللہ خاں	38.00	10.00
62	اجارہ	ای۔اے۔جی۔ رابنس/ ایم۔اے۔ گیلانی	131.00	33.00
63	فسانۂ آزاد جلد 1 تا 4	رتن ناتھ سرشار/ امیر حسن نورانی	1163.00	291.00
64	ہندوستانی سرزمین اور عوام	نارائن گپتا/ ایس۔کے۔ سنگھ	30.00	08.00
65	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	ڈی۔آر۔ گیڈگل/ ایم صدیقی	130.00	33.00
66	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن	رادھے شیام رنگلا/ غلام حیدر	188.00	47.00
67	ابتدائی سماجیات	محمد عبدالقادر عمادی	43.00	11.00
68	ارتقا کائنات انسان و دیگر مضامین	پی۔شیخ علی	94.00	24.00
69	جدید ابتدائی منطق	ایل موسن اسٹینگ/ سلطان علی شلپا	57.00	14.00
70	جان کمپنی سے جمہوریہ تک	مشیر الحسن/ مسعود الحق	114.00	29.00
71	کائنات جلیل	علی احمد جلیلی	80.00	20.00
72	کتب خانہ داری ایک تعارف	شہاب الدین انصاری	108.00	27.00
73	معاشیات کے بنیادی اصول	سراج الحسن	82.00	21.00
74	مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظام حکومت	ہارون خاں شیروانی	82.00	21.00
75	پیمائش و نقشہ کشی	محمد انعام اللہ	85.00	21.00
76	قدیم تامل ناڈو میں عربی و فارسی	کاوش بدری	98.00	25.00
77	سفرنامہ فرہنگ مسیر طالبی	مرزا ابوطالب اصفہانی/ ثروت علی	73.00	18.00
78	شہیدان آزادی (جلد اول و دوم)	پی۔این۔ چوپڑا/ بھگوت سنگھ، سید تفضل حسین	213.00	53.00
79	شخصیت کے نظریات	ساجدہ زیدی	92.00	23.00
80	شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	اے۔ایل۔ باڈنگٹن/ انجم الحسن	150.00	38.00
81	سخنوران گجرات	سید ظہیر الدین مدنی	77.00	19.00
82	تاریخ ہندی فلسفہ (جلد اول)	ایس۔این۔ داس گپتا/ رائے شیو موہن لال ماتھر	89.00	22.00
83	تاریخ آصفی	مرزا ابوطالب/ ثروت علی	58.00	15.00
84	اجرتیں	موریس ڈاب/ عبدالرشید	95.00	24.00
85	جدید ہندوستان کے سماجی و سیاسی افکار	ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	178.00	45.00
86	جنوبی ہند کی تاریخ	آئی۔سی۔ایچ۔آر/ آر۔کے۔ بھٹناگر	114.00	29.00

یہ رعایت 31 مارچ 2010 تک دی جائے گی۔

نوٹ: محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا، کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

اقبال کی کہانی

مرتبہ:
جگن ناتھ آزاد
صفحات:84
قیمت:-/11 روپئے

راجہ رام موہن رائے

مرتبہ:
تپندر لال گھوش
صفحات:112
قیمت:-/16 روپئے

حالی

مرتبہ:
صالحہ عابد حسین
صفحات:68
قیمت:-/15 روپے

محمد حسین آزاد

مصنف:
نند کشور وکرم
صفحات:79
قیمت-/18 روپے

بچوں کے نہرو

مرتبہ:
ایم۔ چلاپتی راؤ
صفحات:112
قیمت-/32 روپے

شنکر

مصنف:
اے کے شنکر
صفحات:128
قیمت-/35 روپے

افغانستان میں جدید دری (فارسی) شاعری

مصنف:
ڈاکٹر عالم محمد لعل زاد
صفحات:317
قیمت-/80 روپئے

تذکرہ علمائے بلخ

تالیف:
صفی الدین واعظ بلخی
صفحات:109
قیمت-/42 روپئے

سخنورانِ گجرات

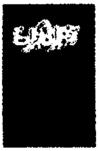

مرتبہ:
سید ظہیر الدین مدنی
صفحات:340
قیمت-/77 روپے

جدید ہندوستان کے معمار

مصنف:
احمد
صفحات:224
قیمت-/14 روپے

واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات

مصنف:
کوکب قدر سجاد علی میرزا
صفحات:688
قیمت-/97 روپے

پرواز

مصنف:
اے۔ پی۔ جے۔ عبد الکلام
صفحات:201
قیمت:-/177 روپے

ارضیات کے بنیادی تصورات

مصنف:
وائی ابر چیف
صفحات:560
قیمت:-/105 روپے

برقی توانائی

مصنف:
انجم اقبال
صفحات:235
قیمت:-/94 روپے

ایٹم کیا ہے؟

مصنف:
احمد حسین
صفحات:79
قیمت:-/15 روپے

Date of Publication : 24/2/2010
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, March 2010, Vol. 12, Issue: 3
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

اے آر رحمٰن کو دو ''گریمی'' ایوارڈ

اپنی مقبول ترین فلم ''سلم ڈاگ ملینیر'' میں موسیقی کے لیے آسکر ایوارڈ حاصل کرنے والے مایۂ ناز ہندوستانی موسیقار اے آر رحمٰن نے اب فلمی دنیا کے نوبل انعام کہلانے والے دو ''گریمی'' ایوارڈ حاصل کیے ہیں۔ ''گریمی'' ایوارڈ تقریب میں اے آر رحمٰن کو موشن پکچر کیٹیگری میں بہترین تدوین کے لیے اور بہترین گیت کے زمرے میں ''جے ہو'' نغمے کے لیے دو ''گریمی'' ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس موقع پر اے آر رحمٰن کی بہن ریحانہ نے جو خود بھی میوزک کمپوزر ہیں، کہا کہ اس اعزاز سے ان کا پورا خاندان خوش ہے۔ خود اے آر رحمٰن نے کہا کہ میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ مجھے ''گریمی'' ایوارڈ سے بھی نوازا جائے گا۔

Printed and Published by Dr. M. Hamidullah Bhat. Director, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066. and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by TNPL   Editor: Dr. M. Hamidullah Bhat, Tel: 26103381, 26103938